سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقّی اُردو (ہند) ع ۱۶۵

نسل اور سلطنت

[تاریخ اور سیاسیات میں نسل کا تصوّر]

از

عزیز احمد

بی۔ اے آنرز (لندن)

اُستاد انگریزی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

شایع کردہ

انجمن ترقّی اُردو (ہند)، دہلی

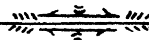
سنہ ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین



دوسرا باب

ذات پات اور خاصانِ خدا



تیسرا باب
جاذب شہنشاہیتیں

(۱)

صفحہ

صفحہ



چوتھا باب

سفید آدمی کا بوجھ

چھٹا باب

علیحدگی پسند شہنشاہی

	صفحہ

مہاجرین پر قیود، جزایر فلی پاین پر رواداران حکومت، امریکہ سیاسیات کی مشین میں غیر نسلوں پر حکومت کرنے کا کوئی جداگانہ ڈھب نہیں، امریکہ کو مقبوضات حاصل کرنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی، امریکہ میں نسلی امتیاز کا معیار رنگ ہی اور نسلی اختلاط کو پسند نہیں کیا جاتا۔

(۵)

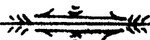
جرمن شہنشاہی، ٹےسی ٹس کی تصنیف "جرمانیا" جرمنوں کا فخر ذرا بے جا ہی، جرمنی میں غیر معمولی نسلی اختلاط ہمیشہ سے ہوتا آیا ہی، اس اختلاط کی تاریخ. جرمنی میں نسلی امتیاز کا تصوّر انیسویں صدی سے شروع ہوا، نارڈک نظریہ اور آریائی نسل کا نظریہ، جرمن شہنشاہی کا بہترین میدان جرمنوں نے ہمیشہ برّاعظم یورپ کو سمجھا، ایسی شہنشاہی کا سخت ترین علحدگی پسند ہونا ضروری تھا، آسٹریا کی شہنشاہی، پروشیا، بسمارک، جرمنی کا اتحاد، سنہ ۱۸۷۱ء میں جرمن وفاق رایش بن گیا، بسمارک کی حکمتِ عملی شروع میں یورپی شہنشاہی کی طرف مایل تھی۔ لیکن جرمن صنعت اور تجارت کی ترقی کے باعث اس کو اپنی حکمتِ عملی بدلنا پڑی، جرمن نوآبادیوں کی ابتدا، جرمن معاشیین اور مورخین کا اصرار، قیصر ولہلم ثانی مشرق کی طرف بڑھنے کی پالیسی، دوسری جنگِ عظیم، دوسری جرمن شہنشاہی کا خاتمہ، وائمار جمہوریت کی کمزوری کے زمانے میں ہٹلر اور نازی جماعت کا عروج، ہٹلر کی یہ تیسری جرمن سلطنت جس کی بنیاد ہی نسلی برتری | ۱۸۶۵ تا ۱۸۹ |

صفحہ

کے تصور پر ہی، جرمن فلسفے میں قومی برتری اور طاقت کے حقوق
کے نظریوں کی اہمیت، ہیگل، فشطے اور ترائتی تشکے کے خیالات، نی تشے
اور مافوق الانسان کا تصوّر، بنی نوعِ انسان کی عدم مساوات پر نی تشے
زور دیتا ہی، اس کی کتاب سے چند اقتباسات، ہٹلر اور اس کے ساتھیوں
نے نسل کے تمام گاؤخوردہ نظریوں کو پھر سے زندہ کیا، نازی جرمنی میں
لفظ VOLK کی اہمیت، ہٹلر کے عروج کی مختصر سی تاریخ، اس کا
نظام العمل یہودیوں پر مظالم اور پابندیاں ہٹلر نے یہودیوں سے
اپنے تعصب کی داستان خود لکھی ہی، ہٹلر کی خود نوشتہ سوانح عمری، اُس
کا گیارھواں باب نسل سے متعلق ہی۔ اس باب سے چند دلچسپ اور
اہم اقتباسات، ہٹلر نے یورپ میں یہودیوں کے گھسنے اور دخیل ہونے
کی تاریخ بھی بیان کی ہی، اُس کا خلاصہ، کیلن یہودیوں کا "اصلی خطرہ"
نسلی ہی وہ اعلیٰ جرمن نسل کو خراب کرتے ہیں، "میری جدوجہد" کے
دوسرے حصے میں نسل کے نظریوں کی بنا پر سیاسی اصول پیش کیے
ہیں۔ VOLKISCH تصوّر، ہٹلر کے ہم خیال امریکی نظریے،
ہٹلر کے خیالات ہندستان اور ہندستانیوں کے متعلق۔

(۶)

موجودہ دوسری جنگِ عظیم جرمنی کی نسل پرستی کا ناخوشگوار ۱۸۹
کارنامہ ہی۔ اگر جرمن جیتے تو دنیا کی دوسری نسلوں کا کیا حشر ہوگا۔



پہلا باب

نسلی امتیاز کی ابتدا

(۱)

بظاہر یہ امر ایک معمّا معلوم ہوتا ہی کہ انسانوں کا ایک گروہ کیونکر انسانوں کے کسی دوسرے گروہ کو اپنے سے بالاتر یا اپنے سے حقیر تر سمجھنے لگا ہوگا۔ اس سوال کا جواب محض ایک لفظ ہی جس میں ہزاروں سال کی تاریخ کا ایک اہم راز پوشیدہ ہی۔ پروپاگنڈا۔ باور کرانے کی کوشش۔

(۲)

تاریخ تمدن انسان کی زندگی کا پہلا دوٗر اس زمانے کو قرار دیتی ہی جب وہ طرح طرح کی کوششیں کر کے غذا جمع کیا کرتا ہی۔[1] اُسے زراعت بھی اچھی طرح نہیں آتی تھی۔ فطرت سے وہ بہت مرعوب اور خایف تھا۔ مذہب نے ابھی جنم نہیں لیا تھا، اور انسان نے اپنے خوف کی تسکین اور انسداد کے لیے من گھڑت تصوّرات کا ایک سلسلہ قایم کر لیا تھا جن کو "جادوٗ" کہا جاتا ہی۔

اگر جادوٗ[2] کا تجزیہ کیا جائے تو دو اہم تصوّرات پر اس کی بنیاد ہی۔

---

[1] W. J. Perry: The Growth of Civilisation

[2] Frazer: Golden Bough; The Magic Art (Vol. I)

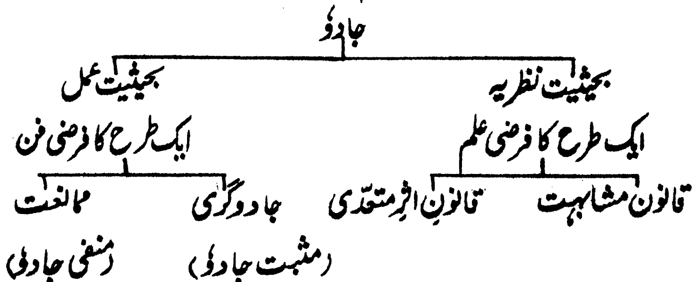
(۱) ایک تو یہ کہ ایک چیز اپنی مشابہ چیز پیدا کرتی ہے یا اپنا اثر ڈالتی ہے، مثلاً کثرتِ اولاد کا اثر فصلوں کے اچھے ہونے پر۔(۲) دوسرا تصوّر یہ تھا کہ اگر کوئی دو چیزیں کبھی ایک دوسرے سے مَس کر چکی ہیں تو جُدا ہونے کے بعد بھی اور بہت زیادہ فاصلے پر ہونے کے باوجود بھی ایک دوسرے پر اثر ڈالتی ہیں مثلاً کسی شخص کے ناخن یا سر کے بال، یا اس کے لباس کا کوئی حصّہ جادو میں اس کو فایدہ یا نقصان پہنچانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ جادو کے اس پہلے تصوّر کو "قانون مشابہت" اور دوسرے کو "قانونِ اثرِ متعدّی" کہا جا سکتا ہے۔ یہاں تک تو جادو کے اِن تصوّرات کو بطور نظریوں کے ظاہر کیا گیا ہے لیکن بہت جلد وحشی انسان نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ جادو کو عملی طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ عملی جادو[۱] کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) جادوگری یعنی عملی جادو کی اثباتی صورت " یہ یہ کرو تو اس عمل کا نتیجہ یہ یہ ہوگا۔"

(۲) ممانعت یعنی عملی جادو کی منفی صورت۔" یہ یہ مت کرو ورنہ اس کا نتیجہ یہ یہ ہوگا"۔ ہم ناظرین کی سہولت کے لیے ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔

وحشی اقوام میں جادو کا تصور



[۱] Frazer : Golden Bough ; The Magic Art (Vol. I).

جادو کا نظریہ اتنا آسان تھا اور اتنی آسانی سے سمجھ میں آسکتا تھا کہ اِس حد تک وحشی انسان کو اُستادوں کے خاص طبقے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ عملی جادو کی حد تک بھی غالباً شروع شروع میں تو ایک پورا قبیلہ یا گروہ مل کر اس قسم کا جادو کرتا ہوگا۔ مگر رفتہ رفتہ گروہ کے زیادہ ہوشیار اور چالاک لوگوں نے اس میں امتیاز حاصل کرنا شروع کیا۔ اور اپنی قابلیت اور برتری ظاہر کرنے کے لیے اس میں طرح طرح کی موشگافیاں شروع کیں۔ جادو کا فن رفتہ رفتہ عوام کے ہاتھوں سے نکل کر خواص کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ انھیں خاص لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت بھی آگئی کیونکہ یہ جادو کے امر ونہی ("جادوگری" اور "ممانعت") جیسے دو اہم اختیارات پر حاوی تھے۔ جب اس طرح کا ایک طبقہ وحشی قبایل میں وجود میں آنے لگا تو اس نے اپنی قوت باقی رکھنے کے لیے بھی طرح طرح کی کوششیں شروع کیں۔ عملی جادو ایک پُراسرار قوت بن گیا جس کے ڈر سے اہل قبایل اپنے یہاں کے جادوگروں کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔ اس طرح انسان کی ابتدائی زندگی کی جمہوریت کی جگہ ایک طرح کی ملوکیت نے لے لی۔ سیاسی ملوکیت کی ابتدا بھی اسی طرح ہوئی ہوگی۔ ایک ہوشیار اور چالاک آدمی قدیم وحشی قبیلے کے "بزرگوں کی مجلس" کی طاقت کو سلب کر لیتا ہے اور خود مختاری سے قبیلے پر حکومت کرتا ہے۔ وحشی قبایل کے پہلے بادشاہ غالباً جادوگر ہوں گے۔ ان کی جادوگری اور اس سے بڑھ کر "ممانعت" کے اختیارات جادو کے حدود سے بڑھ کر تمام امور پر حاوی ہوگئے ہوں گے۔ لیکن جادو کے علاوہ بادشاہت کے اور بھی راستے ہوں گے بعض ممالک میں بادشاہت یا سرداری جادو سے غیر متعلق بھی ہوگی۔ لیکن زیادہ تر وحشی قبایل میں

سرداروں اور جادوگروں میں کافی تعلق ہے۔ مثلاً اب بھی ملایا میں پجاری اور بادشاہ دونوں زرد رنگ استعمال کرتے ہیں، جو شاہی رنگ ہے[1]۔ آیرستان سے لے کر ہندستان تک تمام آریائی زبانیں بولنے والی قوموں کا ایک زمانے میں اعتقاد رہ چکا ہے کہ سردار یا بادشاہ میں ایسی فوق الفطرت یا جادو کی طاقت ہے کہ وہ (اپنی قوت تولید یا اس کے برعکس ضبط تولید سے) زمین کو زرخیز بنا سکتا ہے اور اسی طرح اور بہت سے فایدے پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہولی گریل کے قصے کی ایک تشریح اسی پر مبنی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ تمدن کے اس ابتدائی دور میں زیادہ تر بادشاہ پہلے جادوگر تھے۔ اگرچہ کچھ عرصے کے بعد یہ عمل باقی نہیں رہا اور جب مذہب نے جادو کی جگہ لے لی تو جادوگر بجائے بادشاہ بننے کے پجاری بننے لگے اور مذہب جو جادو کی جگہ عوام کی زندگی پر حاوی ہو چکا تھا، اس کے علمبردار بن گئے۔ اسی زمانے میں دنیوی حکومت اور دینی (مذہبی) حکومت نے اپنے اپنے اثرات کی حدود کو متعین کر لیا اور جہاں تک ہو سکا تعاون کی کوشش کی۔ یہ رسم تاریخی زمانے تک بلکہ آج تک باقی ہے۔ چنانچہ ہندستان میں برہمن اور چھتری طبقوں کا تعلق اور اسی طرح قرون وسطیٰ کے یورپ میں پوپ اور مقدس سلطنت روما (ہولی رومن امپائر) کے شہنشاہ کا تعلق (ابتدائی دور میں) اسی اصول کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

جادوگر بادشاہوں یا جادوگر سرداروں کے طبقے نے اپنی طاقت

---

[1] Frazer : Golden Bough ; The Magic Art (Vol. I).

[2] Jessie Weston From Ritual to Romance

باقی رکھنے کے لیے طرح طرح کی کوششیں شروع کیں جن میں سے ایک کا ہمارے نفس مضمون سے گہرا تعلق ہے۔ اِن جادوگر بادشاہوں نے اس کی کوشش کی کہ وہ اپنے آپ میں ایک طرح کا بنیادی امتیاز ظاہر کریں جس کی وجہ سے وہ اپنے محکوموں کو بلند اور برتر معلوم ہوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے آپ کو اُلوہی صفات کا مرکز اور اس کے باعث عام لوگوں سے ممتاز ظاہر کرنا شروع کیا۔ انسانی تمدّن کی ابتدا کے زمانے میں انسانوں اور دیوتاؤں میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ دیوتا عام طور پر انسانوں کے مشابہ ہی سمجھے جاتے تھے اور انسان ہی کی کمزوریاں اور قوتیں کئی گنے مبالغے کے ساتھ دیوتاؤں سے منسوب کی جاتی تھیں۔ وحشی قبایل کا جادوگر بادشاہ بھی اپنی رعایا کے لیے ایک طرح کا دیوتا ہوتا تھا۔ جادوگر بادشاہ جب دیوتا بننے کا دعویٰ کرتا تو عموماً اس کی دو صورتیں ہوتیں[۱]۔

(۱) عارضی۔ اس صورت میں دیوتا کی روح کچھ عرصے کے لیے اس کے جسم میں حلول کر جاتی اور اس کو علم الغیب ہوتا۔

(۲) مستقل۔ اس صورت میں دیوتا مستقل طور پر ایک انسانی جسم میں رہا جاتا اور اس انسان نما خدا کا یہ فرض ہوتا کہ وہ معجزے دکھا کر اپنی الوہیت کا ثبوت دیتا رہے۔ بعض اوقات دیوتا کی روح انسانی جسم کے مرنے پر کسی دوسرے میں منتقل ہو جاتی (مثلاً دلائی لاما)

(۳)

بہر حال تمدّن انسانی کے اس ابتدائی دَور میں جادوگر بادشاہ یا ایسا بادشاہ جو دیوتا بھی تھا، اپنی اُلوہی خصوصیات کی وجہ سے عوام الناس

---

[۱] Frazer Golden Bough: The Magic Art (Vol. I).

سے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ وہ دیوتا کی اولاد نہیں کہلاتا تھا بلکہ خود دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ ابھی تک "نسل" کا تصوّر انسان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ غالباً انسان ابھی تک یہ بھی نہیں سمجھنے پایا تھا کہ اختلاط جنسی اور استقرارِ حمل میں کوئی تعلق ہے۔ یا باپ کا بھی بچّے کی پیدایش میں کوئی حصّہ ہے[1] "حکومتِ مادری" (میٹریارکل نظریہ) اسی عہد کی پیداوار ہے۔ اس کا اثر ابھی تک دنیا کے بہت سے حصّوں پر باقی ہے۔ جنوبی ہند کی بعض ریاستوں میں ابھی تک یہی طرزِ عمل ہے۔ ماموں کا وارث بھانجہ ہوتا ہے، باپ کا وارث بیٹا نہیں ہوتا۔ جایداد ماں سے بیٹے کو میراث میں ملتی ہے، اور اس کے بعد اس کے بھانجے کو اس کی بہن یعنی اپنی ماں سے۔ ظاہر ہے کہ اس تمدّن میں امتیاز نسلی کی زیادہ گنجایش نہیں تھی اور دیوتا[2] یا بادشاہ یا سردار کی عظمت کی نشانی محض اس کی "اُلوہیت" اس کی مافوق الفطرت طاقت ہوگی۔ چونکہ نسل کا مدار عورت پر تھا اس لیے اکثر یہ بھی ہوتا کہ بادشاہ غیر قوم کے ہوتے۔

لیکن اس تمام عرصے میں انسان برابر ترقی کر رہا تھا۔ جہاں جہاں جغرافیائی حالات اور قدرتی حالات نے اس کی مساعدت کی اس نے فطرت کا اپنے دست و بازو سے مقابلہ کیا۔ ایک طرف تو اس نے اپنی حفاظت اور اپنے کام کاج کے لیے پہلے پتھر اور پھر دھاتوں سے اوزار بنائے اور دوسری طرف پیہم مشاہدے سے اس نے زراعت کے قوانین سمجھے اور سیکھے، اور مشاہدے ہی سے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جنسی اختلاط اور حمل و تولید میں بہت گہرا تعلق ہے۔ اس آخر الذکر راز کے معلوم ہو جانے سے اس کا

---

[1] *Bertrand Russel* : Marriage and Morals.

[2] *Frazer* : Golden Bough ; The Magic Art (Vol. II).

معاشرتی نظام بدل گیا۔ "حکومتِ مادری" کی جگہ "حکومتِ پدری" (پیٹریارکل نظریے کے مطابق) نے آہستہ آہستہ لینی شروع کی اور اس کے ساتھ ہی "نسل" کا احساس شروع ہوا۔

انسانی تمدن نے غذا مہیا کرنے کی منزل سے گزر کر غذا پیدا کرنے (زراعت) کی منزل میں قدم رکھا اور انسان نے مستقل مزاجی سے آباد ہونا شروع کیا۔ دنیا کے تمام ابتدائی تمدنوں میں خواہ وہ ایک دوسرے سے جغرافیائی اعتبار سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں ایک چیز مشترک تھی اور وہ یہ کہ ان سب کی بنیاد زراعت اور آبپاشی پر تھی۔ لیکن اس زمانے میں چند در چند وجوہ سے محض جادو کے کمالات پر اس قسم کے مفروضات سے بادشاہ کا رعب وداب اور اس کی طاقت قایم نہیں رہ سکتی تھی۔ اس عرصے میں مذہب وجود میں آچکا تھا اور جادوگر بدل کر پجاری بننے لگے تھے۔ جہاں کہیں مذہب نے ابھی تک نشو و نما نہیں پائی تھی وہاں بھی "باپ" گوشۂ گمنامی سے نکل کر قابلِ توقیر بن گیا تھا۔ (وحشی انسان عورتوں کے لالچ میں "باپ" کو قتل کر دیتا تھا۔ ممکن ہے اس کا کفارہ سمجھ کر وہ باپ کی توقیر کرنا ضروری سمجھنے لگا ہو[1]) تمدن کے اس دوسرے دور میں انسان نے اپنے باپ پر فخر کرنا شروع کیا تو بادشاہوں نے آگے بڑھ کے اپنے آپ کو دیوتا کا بیٹا یا دیوتا کی اولاد ظاہر کرنا شروع کیا۔ چنانچہ قدیم اسکینڈینیویا کے بادشاہ، جو ساتھ ہی ساتھ مہا پجاری بھی ہوتے تھے[2] اس کا دعویٰ کرتے تھے کہ وہ فری یا (Freja.) کی اولاد سے ہیں۔ جو

---

[1] *Freud*: Totem und Taboo.

[2] *W. J. Perry*: The Growth of Civilisation.

شمالی دیومالا اور مذہب میں سب سے بڑی دیوی سمجھی جاتی تھی۔ فراعنۂ مصر اپنے آپ کو سورج دیوتا کی اولاد کہتے تھے اور خود دیوتا ہونے کا دعویٰ کرتے۔ اسی طرح راجپوتوں میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کے حالات سے ہمارے اکثر ناظرین واقف ہوں گے۔

ان شاہی خاندانوں کا جو اس طرح دیوتاؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے تھے ایک نشان امتیازی ہوتا تھا جو ان کو متعلقہ دیوی یا دیوتا سے منسوب کرتا تھا۔ نشان عموماً کسی جانور کی تصویر تھا مثلاً بنڈیلا یا شیر یا عقاب یا اسی طرح کا کوئی اور جانور یا پرندہ ۔ مہابھارت میں اس قسم کے نشانوں کا ذکر ہے۔

المختصر یہ بادشاہ جو دیوتاؤں کی اولاد ہونے کے مدعی تھے ایسی رعایا پر حکومت کرتے تھے جو دنیا کے سرسبز و شاداب خطوں میں یا سونے کی کانوں کے پاس اطمینان اور فراغت کے ساتھ زراعت اور کان کنی، آبپاشی اور صنعت میں مصروف تھی۔ دیوتاؤں کی اولاد ہونے کی وجہ سے بادشاہ اپنی رعایا سے ہر طرح ممتاز تھے۔ اپنی آدم زاد رعایا پر ان کی فوقیت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ "نسل" میں کہیں زیادہ برتر سمجھے جاتے تھے۔ ایشیا میں بادشاہ کے ظل اللہ ہونے کے تصور اور یورپ میں بادشاہ کے "حقِ خداوندی" (ڈیوائن رائیٹ آف کنگز) کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔[1]

رفتہ رفتہ شاہی خاندانے عوام الناس سے الگ ہو کے ایک جُداگانہ "ذات" بن گئے اور آبادی دو ذاتوں میں منقسم ہو گئی "شاہی گھرانے"

---

[1] W. J. Perry: The Growth of Civilisation

اور" عوام الناس"۔ یہ دو ذاتیں "اونچی ذات" اور "نیچی ذات" معاشی نقطۂ نظر
سے بھی ایک دوسرے سے ممتاز تھیں اور ان میں سے پہلے کی بنیاد
دوسرے کی محنت اور خدمت پر تھی۔ فراعنۂ مصر کی رُوح پرواز کر کے
آسمان پر جاتی تھی لیکن ان کے محکوموں کی رُوحیں زمین کے نیچے تحت الثریٰ
میں جاتی تھیں۔

اس طرح[1] تمدن کے اس دوَر میں جب انسانوں کے فارغ البال
گروہ زراعت او صنعت برت رہے تھے اور زرخیز دریاؤں کی وادیوں
میں کاشت کرتے یا امریکہ اور جنوبی افریقہ، وسط اور مغربی ایشیا اور
ہندستان کی سونے کی کانیں کھود رہے تھے، وہ "نسل" کے ایک فرضی
تصور کے عادی ہو چلے تھے۔ یہ تصور ان کے حکمران بادشاہوں اور
سرداروں کا عاید کیا ہوا تھا جو خود کو دیوتاؤں کی اولاد اور عوام الناس
کو آدمی زاد اور اپنے سے کمتر قرار دیتے تھے۔

(۴)

دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف زمانوں میں تاریخ تمدن کے
ایک نئے باب کا آغاز ہوا اس باب کا عنوان "جنگجوؤں کی آمد" ہو سکتا ہے۔
انسانوں کے بہت سے گروہ ایسے خطوں میں بھی آباد تھے جہاں
قدرت نے ان کے لیے آسانیاں اور آرام فراہم نہیں کیے تھے۔ اِن
بیابانوں اور پہاڑوں یا اسی قسم کے غیر زرخیز خطوں میں رہنے والی
قوموں نے اپنے خوش قسمت لیکن آرام طلب ہمسایوں پر حملہ کر کے ان کی
زرخیز زمینوں پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش گویا "محروم" اقوام

---

[1] W. J. Perry: The Growth of Civilisation.

کی کوشش تھی کہ دنیا کی نعمتوں کا کچھ حصہ انھیں بھی ملے جنگجوؤں کی آمد کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہونے پاتا، جب ایک گروہ زرخیز زمینوں میں بس کے آرام طلب بن جاتا ہی تو کسی نہ کسی جنگجو قوم کے جتھے حملہ کرکے اس کی ملکیت پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اس کو محکوم بنا لیتے ہیں۔ تہذیب و تمدن سے ناآشنا قومیں ہن، تاتاری، مغل، ترک اور اسی طرح کی ہزاروں قومیں بیابانوں سے اٹھیں اور متمدن ممالک پر چھا گئیں۔

یہ جنگجو حملہ آور قومیں جو خانہ بدوش تھیں متمدن اور آباد قوموں کے مقابل وحشی تھیں۔ کبھی کبھی متمدن اقوام کا تمدن ان فاتحوں کو اپنا مفتوح بنا لیتا ہی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہی کہ وہ مفتوحین سے صرف کچھ چیزیں سیکھتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ فاتح قومیں مفتوحین کو جبراً یا بطور تلقین اپنا تمدن ـــــ بشرطیکہ ان کا کوئی تمدن ہو بھی ـــــ سکھانے کی کوشش کرتی ہیں۔

جنگ اور فتوحات، قتل اور غارت گری کے زمانے میں جہاں تک "نسل" کا تعلق ہی دوگونہ عمل ہوتا رہتا ہی۔ ایک طرف تو فاتحین کے لیے ان کی "نسل" (بہ معنی قومیت یا چند نمایاں جسمانی خصایص مثلاً رنگ یا چہرے اور جسم کی وضع قطع) ہی باعثِ امتیاز ہوتی ہی اور ان کے مفتوح اور محکوم پست اقوام قرار دیے جاتے ہیں لیکن دوسری طرف اس کے برعکس عمل یہ ہوتا رہتا ہی کہ امن کے فقدان اور قتل اور غارت گری کی گرم بازاری کے زمانے میں زنا اور زنا بالجبر کو بھی بہت فروغ ہوتا ہی۔ اس طرح فاتح قوم جو شروع میں ممتاز ہوتی ہی، بہت جلد مفتوح قوم میں گھلنے ملنے لگتی ہی اور اس کے بعد جب وہ سرزمین میں آباد

نقشہ نمبر (۱)



یورپ پر جنگجو اقوام کے حملے تقریباً ایک ہزار سال کے عرصے میں۔ جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ زمانۂ ماقبل تاریخ اور تاریخی زمانے میں دنیا بھر کے تمام حصوں میں کس قدر نسلی اختلاط ہوا ہوگا

ہوجاتی ہے تو مفتوح قوم سے شادی بیاہ کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتا ہے اور "نسلی" امتیاز رفتہ رفتہ مفقود ہوجاتا ہے۔

اس "نسلی" امتیاز کو باقی رکھنے کی صرف یہی صورت ہے کہ مفتوح قوم سے شادی بیاہ کرنے، اس سے ملنے جُلنے، اس کو اپنے برابر سمجھنے کی سرکاری طور پر سخت ممانعت کردی جائے۔ اس قسم کی کوششیں دنیا میں بار بار کی گئیں مگر ان میں کامیابی نہ ہوئی۔

(۵)

ہم دیکھ آئے ہیں کہ زرخیز سرزمینوں میں رہنے والے انسان جو زراعت اور صنعت میں ممتاز ہونے لگے تھے اس کے عادی ہو گئے تھے کہ اپنے بادشاہوں کو فوق البشر سمجھیں اور انھیں دیوتاؤں کی نسل سے یا ایک طرح کا دیوتا مانیں۔ اس طرح یہ لوگ پہلے ہی سے "نسل" کے ایک فرضی تصوّر اور ایک فرضی نسلی امتیاز کے قایل ہو گئے تھے۔ فاتح قوموں نے جب اِن زراعت پیشہ لوگوں پر حکومت کی ابتدا اور اپنی برتری جتانا شروع کی تو یہ لوگ ان کو اپنے سے برتر سمجھنے لگے ہوں گے۔ چنانچہ تمدّن کے وہ موّرخین جو تمدّن انسانی کی ایک ہی جڑ قرار دیتے ہیں اور جو نسلی نفوذ و انتشار کے نظریے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ بادشاہ کی "نسلی" برتری" (دیوتا کی اولاد ہونا) اور جنگجو قوموں کے دعوائے برتری میں اہم تعلق ہے[۱]۔ نہ صرف یہ بلکہ حاکم اور محکوم قوموں کے تعلق کی بنا پر "معاشی طبقوں" کی بھی بنا پڑتی ہے۔ حاکم اقوام اور ایسے بادشاہ جو دیوتاؤں کی نسل سے کہلاتے تھے اعلیٰ طبقے سے تھے، اور محکوم اقوام

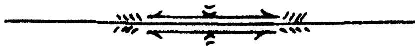
---

[۱] W. J. Perry: The Growth of Civilisation.

اور ایسے بادشاہ جو دیوتاؤں کی نسل سے کہلاتے تھے اعلیٰ طبقے سے تھے اور محکوم اقوام کے افراد یعنی عوام النّاس کا بڑا طبقہ ادنیٰ طبقے سے۔ اس میں یہ بھی ہوتا تھا کہ کچھ عرصے کے بعد حاکم قوم کے عام باشندے بھی رفتہ رفتہ محکوموں کے طبقے میں شامل ہو جاتے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حاکم اور محکوم قوموں کے تعلّقات شادی بیاہ اور ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے قدرتی طور پر بہت گہرے ہو جاتے اور رفتہ رفتہ حاکم اور محکوم مل کر ایک ہو جاتے۔ یہ طرزِ عمل دنیا کے تمام حصّوں میں ہو رہا ہے اور ازمنۂ ماقبل تاریخ میں اس قدر نسلی اختلاط ہوا ہے کہ کوئی قوم اپنے آپ کو "خالص" نہیں کہہ سکتی۔

ہاں تاریخی زمانے میں چند قوموں نے اپنی "نسل" کو خالص رکھنے کی کوشش ضرور کی۔



دوسرا باب

ذات پات اور خاصانِ خدا

(۱)

ایسی جنگجو اقوام ہزارہا کی تعداد میں ہوں گی اور جب اُنھوں نے اِن امن پسند اقوام پر حملہ کیا ہوگا جو دریاؤں کی شاداب وادیوں اور چراگاہوں میں آباد تھیں تو یقیناً نسلی اختلاط ہوا ہوگا[1]۔ اور یہ نسلی اختلاط اس قدر ہمہ گیر اور مکمل ہوگا کہ آج دنیا کی کوئی قوم یا کوئی جماعت کسی "خالص نسل" سے ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی[2]۔

پھر بھی انسانوں کے بڑے بڑے گروہ ایسی ٹکڑیوں میں منقسم ہیں جو رنگ، سر کی ساخت اور بسااوقات چہرے کی ساخت اور قد میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس قسم کی جُدا جُدا "نسلیں" جُدا جُدا جغرافیائی خطوں میں بستی ہیں اور اکثر جُداگانہ اقسام کی زبانیں بولتی ہیں۔

(ا) نسلوں کی تقسیم کے کئی معیار ہیں۔ ان میں سے یورپ میں (اور خصوصاً انگلستان میں) سب سے زیادہ مقبول معیار رنگ کا ہے[3]۔ رنگ کے لحاظ سے بنی نوع انسان کو پانچ گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) سیاہ رنگ "نسل" اس گروہ میں افریقہ کے حبشی اور ان کی نسل کے

---

[1] W. J. Perry: The Growth of Civilisation.

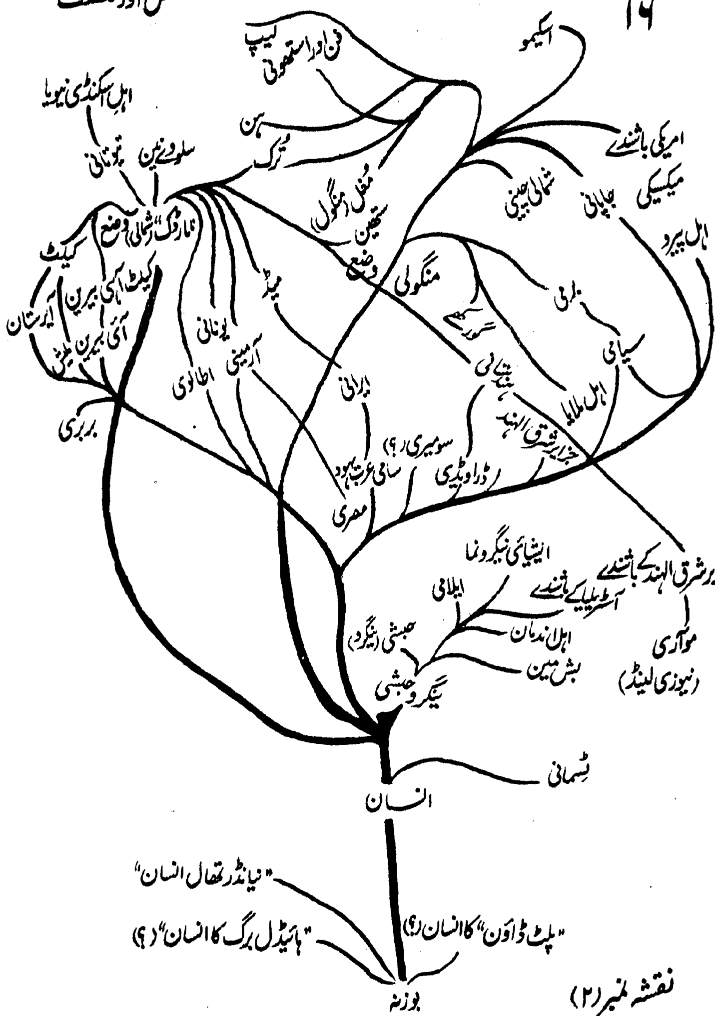
[2] ملاحظہ ہو نقشہ نمبر (۲) [3] ملاحظہ ہو نقشہ (۳) صفحہ ۱۶ و ۱۷

باشندے جو دنیا کے بعض اور حصّوں میں آباد ہو گئے ہیں شامل ہیں۔ شرق الہند کے بعض بعض جزایر میں بھی سیاہ رنگ کے لوگ آباد ہیں۔

(۲) گندمی رنگ کی "نسل" اس گروہ کے باشندے شمالی افریقہ، حبش، سمالی لینڈ، ایشیائے کوچک، عرب، عراق، ایران، آرمینا، جارجیا، خوارزم، ترکستان، چینی ترکستان، افغانستان، بلوچستان، ہندستان، لنکا، برما، سماٹرا، جاوا، بورنیو اور جزایر شرق الہند میں اکثر اور بیشتر آباد ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ ان کا تعلق نام نہاد "میڈی ٹرےنین نسل" سے ہے جس سے اطالوی، ہسپانوی وغیرہ بھی ہیں۔ ایک دوسرا نظریہ یہ ہے کہ یہ گروہ نارڈک (سفید رنگ) اور سیاہ رنگ نسلوں سے مل کر بنتا ہے اور ان میں زرد (چینی) نسلوں کا بھی خون شامل ہے۔ چہرے کے خدوخال کی حد تک یہ لوگ سفید اقوام سے قریب ہیں۔

(۳) زرد رنگ کی "نسل" اس نسل کے لوگ تبت، منگولیا، مانچوریا، کوریا، چین، ہند چینی سیام اور جزایر جاپان میں بستے ہیں۔ ان لوگوں کا رنگ زردی مایل ہوتا ہے اور چہرے کے خدوخال سفید اور گندمی رنگ کی اقوام سے مختلف ہوتے ہیں، آنکھیں عموماً چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں۔ اس "نسل" کے افراد نے بھی دنیا کے تمدن کی بہت خدمت انجام دی ہے۔ اور جاپان کی ترقی کے بعد سے "سفید اقوام" کے لیے زرد خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

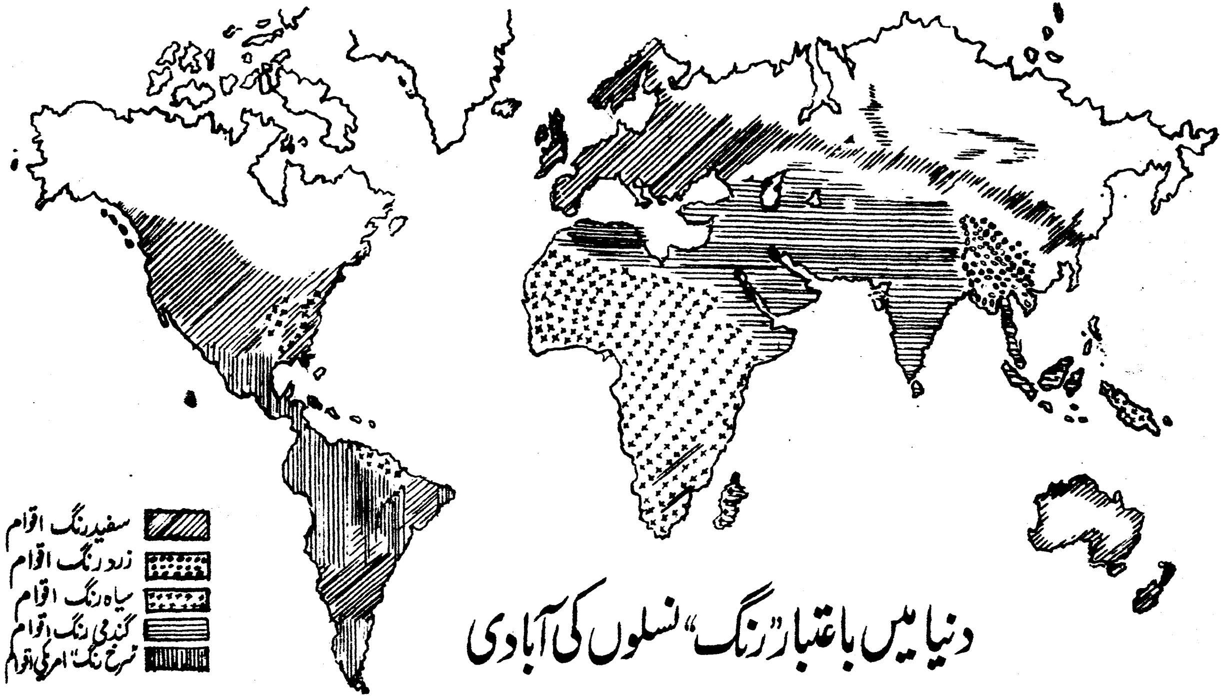
(۴) لال رنگ کی "نسل" کو دریافت ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ان کی کئی قسمیں ہیں۔ شمالی امریکہ کے اصلی باشندے جنوبی امریکہ کے باشندوں سے بہت مختلف ہیں۔ ان لوگوں کا رنگ دراصل لال نہیں مگر ان کو اصلی ہندستانیوں سے ممتاز کرنے کے لیے سُرخ ہندستانیوں کا لقب دے دیا



نقشہ نمبر (۲)

انسانی نسلوں کا باہمی تعلق (مرتبہ ایچ۔ جی۔ ویلز اور جے۔ ایف ہیروین)

(انسانی نسلیں باہمد گر اس قدر ایک دوسرے سے شادی بیاہ کر رہی ہیں اور اس قدر ملتی جلتی رہی ہیں کہ یہ نقشہ بھی کوئی صحیح معیار نہیں "نسل" کے اور معیاروں مثلاً "خون کے گروہوں" کے نظریے کے اعتبار سے اس سے بھی کہیں زیادہ نسلی اختلاط ہوا ہے)


دنیا میں باعتبار "رنگ" نسلوں کی آبادی
سفید رنگ اقوام
زرد رنگ اقوام
سیاہ رنگ اقوام
گندمی رنگ اقوام
سرخ رنگ "امریکی اقوام"

گیا ہے۔ اس "نسل" کے بعض بعض گروہوں نے بہت اعلیٰ درجے کے تمدّنوں کی بنیاد ڈالی مثلاً پیرو میں انکائی تمدّن۔

(۵) سفید رنگ کی "نسل" اس نسل کو "بے رنگ" نسل بھی کہتے ہیں اور یہ نسل دنیا کی تمام نسلوں کو رنگ والی نسل کہتی ہے۔ یورپ میں اس گروہ کا بڑا حصہ آباد ہے اور یورپ سے نکل کر شمالی امریکہ کے بڑے حصے جنوبی امریکہ کے جنوبی حصے آسٹریلیا، سائبیریا اور جنوبی افریقہ میں نوآبادیاں قایم کر رہا ہے ان نوآبادیوں میں سفید رنگ کی نسل دوسری قوموں کے آباد ہونے کی روادار نہیں۔

لیکن باعتبار رنگ نسلوں کی تقسیم سرتاسر غلط ہے۔ تاریخی زمانے ہی میں پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ایک رنگ کے لوگ دوسرے رنگ کے لوگوں پر حملہ آور ہوئے، قبضہ کیا اور ان میں گھُل مل گئے۔ مثلاً ہن اقوام جو دراصل زرد رنگ کی ہیں یورپ میں بس گئیں اور آج اہل ہنگری میں اور یورپ کے دوسرے ملک کے باشندوں میں امتیاز مشکل ہے۔ اسی طرح ترکوں کی (زرد اور گندمی) سلطنت صدیوں تک بلقان اور وادی ڈینیوب میں باقی رہی۔ اس زمانے میں غیر معمولی حد تک دو مختلف رنگ کے باشندوں میں نسلی اختلاط ہوا ہوگا۔ اسی طرح تاتاری قبایل مشرقی یورپ اور مشرق اقصیٰ اور وسطیٰ پر حاوی رہے۔ اس زمانے میں بھی غیر معمولی نسلی اختلاط ہوا ہوگا اور اس کی سب سے نمایاں مثال جنوبی امریکہ میں اسپین اور پرتگال کے حکمران گھرانوں اور اصل باشندوں کے میل ملاپ میں ملتی ہے۔

جب تاریخی زمانے میں ہمیں مختلف رنگ کی اقوام کے اختلاط باہمی شادی بیاہ یا عورتوں کو پکڑ کر لے جانے کی اتنی مثالیں ملتی ہیں تو

زمانۂ ماقبلِ تاریخ میں جبکہ انسان وحشی تھا۔ ایسی مثالیں لاکھوں کی تعداد میں ہوں گی۔ اگر آج اہلِ فنستان، اہلِ ہنگری اور یورپ کے دوسرے باشندوں میں امتیاز مشکل ہے تو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی نسل "خالص" ہے اور اس کا رنگ شروع ہی سے ایسا ہو گا۔

غرض رنگ کے امتیاز کی بنا پر نسل کی تقسیم سراسر غلط ہے۔

علم النسل کے ماہرین نے اب عام طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ جغرافیائی حالات اور آب و ہوا کا انسان کے رنگ پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے[1]۔ اس کے علاوہ محض رنگ کو کوئی معیار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ افریقہ کے حبشی اور آسٹریلیا کے اصلی باشندے کا رنگ ایک ہی ہے لیکن دوسرے نسلی خصایص سے دونوں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

(ب) نسلی امتیاز کا ایک اور معیار بال اور بالوں کا رنگ ہیں اس لحاظ سے بنی نوع انسان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) Leiotrichy. سیدھے پتلے بال جو نیچے جھکے ہوئے ہوتے ہیں جیسے چینیوں اور ملایشیا کی اور کئی زرد رنگ اقوام کے بال۔ اسکیمو لوگوں کے بال بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں۔

(۲) Cymotrichy. ہموار لیکن بل کھاتے ہوئے اور گھونگر والے بال مغربی ایشیا، یورپ، شمالی مشرقی افریقہ اور ہندستان کے لوگوں کے بال اس طرح کے ہوتے ہیں۔

(۳) Ulotrichy. اُون کے جیسے بل کھائے ہوئے بال اس طرح کے بال حبشیوں کے اور آسٹریلیا اور بعض جزایر شرق الہند کے اصلی

---

[1] *Julian Huxley and A. C. Haddon:* **We Europeans.**

باشندوں کے ہوتے ہیں۔

بالوں کے رنگ کی حد تک یہ کہ یورپ کے باہر اور یورپ کے اندر کے اکثر حصّوں میں بھی بالوں کا رنگ عام طور پر سیاہ ہوتا ہے حالانکہ کبھی کبھی اس میں بھورے پن یا سُرخی کی جھلک بھی ہوتی ہے۔ شمالی یورپ اور یورپ کے بہت سے حصّوں میں بال ہلکے رنگ کے ہوتے ہیں کبھی سنہرے کبھی زردی مایل، کبھی راکھ کی رنگت کے اور اسی طرح اور بہت سے ہلکے رنگوں کے، سُرخ بال مغربی ایشیا اور یورپ میں اکثر پائے جاتے ہیں۔ اہل ویلس، آیرستانیوں، شمالی اسکاچوں، یہودیوں اور فنیون کے بال اکثر سُرخی مایل ہوتے ہیں۔

(ج) نسلی امتیاز کا ایک تیسرا معیار آنکھوں کا رنگ اور آنکھوں کی وضع ہے۔

بالعموم آنکھوں کا رنگ جسم اور بالوں کے رنگ سے مشابہ ہوتا ہے۔ آنکھیں بھی جلد کے رنگ کی طرح قدرت کی اس تدبیر کی پابند ہیں کہ اپنے جغرافیائی ماحول کو برداشت کر سکیں۔ مثلاً خط استوا کے قریب رہنے والوں کی سیاہی مایل جلد اور سیاہی مایل آنکھوں کی پُتلیاں گرمی کو زیادہ برداشت کر سکتی ہیں۔ یورپ کے باشندوں کی سفیدی مایل جلد اور نیلی یا بھوری آنکھیں گرمی اور آفتاب کی تمازت کی اس قدر متحمل نہیں ہو سکتیں۔ آنکھوں کی وضع کی حد تک یہ کہنا کافی ہوگا کہ چینیوں یا "منگول" اقوام کی آنکھیں چھوٹی اور پتلی ہوتی ہیں اور اہل یورپ اور ایشیا کے دوسرے باشندوں کی آنکھوں سے بہت مختلف ہوتی ہیں۔ اس قسم کی آنکھیں شاذونادر حبشیوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

(ی) قد کو بھی نسلی اختلاف کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اب یہ مسلّم ہے کہ جغرافیائی ماحول اور آب و ہوا کا اثر قد پر پڑتا ہے، پھر بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ ایک حد تک قد کا نسل سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے۔ مثال کے طور پر شمالی ناروے میں ایک طرف تو بلند قامت نارویجین باشندے بستے ہیں اور ان کے ساتھ پستہ قد لیپ (لیپ لینڈ کے) باشندے بھی آباد ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی قد کو نسل کا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ قد اکثر جغرافیائی ماحول کا پابند ہوتا ہے اور اس کے علاوہ ایک ہی گروہ اور ایک ہی خاندان کے افراد میں بسا اوقات قد کا اس قدر فرق ہوتا ہے کہ صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔

(س) سر کی وضع، علم الانسان کے ماہرین کے خیال میں نسل کا سب سے زیادہ بھروسے کے قابل معیار ہے۔ سر کی لمبائی اور چوڑائی کے تناسب پر سر کی وضع کے معیار کو قایم کیا گیا ہے۔ زندوں کے سر کے ناپ کو "سیفالک" اور مُردوں کی کھوپڑیوں کے ناپ کو "کرے نیل انڈکس" کہتے ہیں۔ سر کی وضع کے اعتبار سے بنی نوع انسان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) ڈولی کوسی فالک — یا لمبے اور پتلے سر والا گروہ
(۲) میسوکیبی فالک — اوسط سر والا گروہ
(۳) براکی سے فالک — چھوٹے اور چوڑے سر والا گروہ

یہ تقسیم اگرچہ دوسرے معیاروں کے مقابل اگرچہ زیادہ قابل اعتماد ہے لیکن پھر بھی یہ قطعی نہیں۔ پہلے تو یہ کہ اس اعتبار سے گروہوں کی تقسیم کو قطعی نہیں تسلیم کیا جاسکتا، دوسرے یہ کہ اس طرح سروں کی ناپ میں

بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہی، اختلاف کی اس قدر گنجایش ہی کہ ہزاروں سروں کو ناپنے کے بعد اوسط نکالنا پڑتا ہی، ایک اور مشکل یہ بھی ہی کہ بعض نسلوں میں سر کی ساخت اور قد میں تعلق ہوتا ہی اور اس تعلق کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہی۔

(س) ناک کی وضع بھی نسل کی شناخت کا ایک معیار سمجھا جاتا ہی۔

(ص) ایک نفسیاتی معیار ہی مگر وہ بھی اور تمام معیاروں کی طرح ناقص اور غیر مکمل ہی چنانچہ ایک بہت بڑے امریکن ماہر نفسیات کے الفاظ یہ ہیں[1]:

"علم الانسان کے ماہرین ابھی تک نسل کے کسی ایسے معیار پر متفق الرائے نہیں ہوئے جس کی بنیاد پر ماہرین نفسیات نسلی گروہوں کو الگ الگ سمجھ کے اُن کا امتحان کریں۔ ماہرین نفسیات بھی ابھی تک ایسے دماغی امتحانات لینے سے قاصر رہے ہیں جن کو ماہرین علم الانسان دماغ کی صلاحیت کا صحیح اندازہ کرنے کے قابل سمجھنے پر تیار ہوں۔ اِن دونوں علوم کے ماہرین میں سے کسی نے بھی اب تک اپنے فنی طریق کار کو مکمل نہیں کیا ہی"

(ط) خون بھی امتیاز نسل کا معیار ہی۔ خون کے معیار دو ہیں۔

ایک تو پُرانا معیار جو بالکل بے بنیاد ہی اور جس سے ہم ہندستانی بھی عرصے سے واقف ہیں اس کو "خون کا رشتہ" کہا جاتا ہی۔ انیسویں صدی سے پہلے یہ نظریہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی بنیاد[2] ارسطو کے اس غلط

---

[1] E. A. Hooton: up from the Ape.

[2] Julian Huxley and A. C. Haddon: We European.

نظریے پر تھی کہ ایامِ حمل میں جب کہ عورت کا خون حیض کی صورت میں خارج نہیں ہوتا، بچّے کی غذا اور پرورش کا باعث بن جاتا ہے۔ اسی قسم کی ایک توجیہہ توریت میں بھی ہے۔ اس نظریے کو عام طور پر غلط تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ ماں کا خون بچّے کے جسم میں براہ راست داخل نہیں ہوتا، اس طرح "خون" کے رشتے کا یا "خون ملے ہونے" کا ذکر محض مہمل ہے۔

لیکن نسلی امتیاز کے لیے خون کا ایک اور معیار بھی ہے، جس کا علم توالد و تناسل سے تعلق ہے۔ اس کے اعتبار سے انسانی نسلوں کو "خون کے گروہوں" میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

اس صدی کے اوائل میں جب ایک شخص کا خون دوسرے کے جسم میں منتقل کرنے کی طبّی کوششیں شروع ہوئیں تو یہ محسوس کیا گیا کہ ہر شخص کا خون ہر دوسرے شخص کے جسم میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ مزید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ بنی نوع انسان میں "خون کے گروہ" موجود ہیں اس قسم کے گروہ چار ہیں۔

(۱) پہلا گروہ جس کے خون کی جسمیات میں "اے بی" چپچپیدگی کے مادّے ہوں
(۲) دوسرا گروہ جس کے خون کی جسمیات میں "اے" چپچپیدگی کے مادّے ہوں
(۳) تیسرا گروہ جس کے خون کی جسمیات میں "بی" چپچپیدگی کے مادّے ہوں
(۴) چوتھا گروہ جس کے خون کی جسمیات میں "او" چپچپیدگی کے مادّے ہوں

اکثر سائنس دانوں نے جن میں پروفیسر جے۔ بی۔ ایس ہالڈین[1] بھی شامل ہیں، اِس امکان پر زور دیا ہے کہ خون کے گروہوں کے ذریعے

---

1. B. S. Haldane : Pre-History in Light of Genetics [۱]
(The inequality of Man and other Essays).

نسل کی تشخیص ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ رہنے والوں کے خون کی جسمیات میں اگر "او" مادّے زیادہ ہوں تو اس کو مجموعی طور پر ایک خالص نسل قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس تشخیص سے اکثر نسل کے دوسرے معیاروں یعنی رنگ یا سر کے بالوں یا سر کی ساخت کے معیاروں کی غلطی کا اندازہ ہوتا ہے۔ متمدن قوموں کی حد تک اگر اس طریقے کو استعمال کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کس غیر معمولی حد تک ایک ہی قوم کے باشندوں اور ایک ہی جگہ رہنے والی قوموں کے افراد "خون کے گروہوں" کے اعتبار سے باہم مختلف ہیں۔ یہ خاکہ پروفیسر ہال ڈین ہی کی کتاب سے نقل کیا جاتا ہے۔

آبادی		خون کے گروہوں کے لحاظ سے تقسیم فی صد			
		اے بی	اے	بی	او
ہائیڈل برگ کے جرمن باشندے		۵	۴۳	۱۲	۴۰
ہنگری میں	جرمن بولنے والے	۳	۴۳	۱۳	۴۱
ہنگری میں	میگیار	۱۲	۳۹	۱۹	۳۱
ہنگری میں	جپسی	۶	۲۱	۳۹	۳۴
شمالی ہندستان کے ہندستانی باشندے		۹	۱۹	۴۱	۳۱

اس نقشے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "نسل" کی جانچ کا یہ طریقہ بڑا اُمید افزا ہے لیکن بقول پروفیسر جولین[1] ہکسلے جوں جوں زیادہ تفصیل سے "خون کے گروہوں" کی جانچ کی جائے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں

[1] Julian Huxley and A. C Haddon: We Europeans.

بہت سی دشواریاں ہیں۔ اُن دشواریوں کا اثر یہ ہے کہ نسلی تشخیص کے نتیجے بھی خاطر خواہ نہیں نکلتے اور اگر خون کے امتحان سے کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو "اگرچہ جو مواد اس طرح فراہم ہوتا ہے اس سے اس خیال کی تایید ہوتی ہے کہ ایک زمانے میں انسانی گروہ ایک دوسرے سے اس قدر ممتاز تھے کہ وہ مختلف "نسلیں" کہلانے کے مستحق تھے مگر اسی مواد سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بالکل ابتدائی زمانے سے اب تک بے انتہا نسلی اختلاط ہوتا رہا ہے"[1]

(ع) اب "نسل" کا صرف ایک معیار اور باقی رہ گیا ہے اور یہ سب سے غلط معیار ہے یعنی زبان کا معیار اس معیار کی حد تک ہم تفصیلی بحث کریں گے۔

"نسل" کے امتیاز اور تشخیص کے ان تمام معیاروں کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ناظرین کو محسوس ہو گیا ہو گا کہ ان میں سے ہر معیار سے کسی نہ کسی دوسرے معیار کی تردید اور تغلیط ہوتی ہے۔ کوئی دو معیار ایک نتیجے کی طرف نہیں پہنچاتے اور کسی ایک معیار کو قطعی اور مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

اس لیے جہاں تک نسلوں کی تقسیم کا سوال ہے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ پہلے تو صرف یہ پتہ چلتا ہے:-

معلوم شُد کہ ہیچ معلوم نہ شُد

اور اُس کے بعد ایک اور حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگرچہ ہم انسانی نسلوں کی اصلی اور ابتدائی تقسیم سے ناواقفِ محض ہیں لیکن ان سب نسلوں میں غیر معمولی اختلاط جنسی ہوا ہے اور کوئی نسل "خالص نسل" کہلانے کی مستحق نہیں بلکہ جولین ہکسلے وغیرہ تو لفظ "نسل" (ریس کے) استعمال کے

---

[1] Julian Huxley and A. C. Haddon: We Europeans.

مخالف ہیں۔ لفظِ "ریس" جو انگریزی زبان میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے
بلحاظ معنی بہت مبہم ہے۔ یہ لفظ عبرانی یا عربی الاصل ہے اور ان زبانوں سے
یورپ کی زبانوں میں مستعار لیا گیا۔ شروع شروع میں یہ لفظ اُن جانوروں
کے لیے استعمال ہوتا تھا جو ایک ہی جانور کے جوڑے کی اولاد ہوں (جن
معنوں میں ہمارے یہاں لفظ "اصل" استعمال ہوتا ہے) لیکن رفتہ رفتہ انگریزی
میں یہ لفظ انسانوں پر منطبق کیا جانے لگا، چنانچہ (۱۵۷۰ء) میں یہ لفظ
پہلی مرتبہ[1] ان معنوں میں تحریر ہوا۔ اس لفظ کا استعمال اس قدر مبہم معنوں
میں ہوتا گیا جتنے مبہم معنی اب اردو لفظ "نسل" کے ہیں۔

(۲)

زبان کو "نسل" سے کوئی واسطہ نہیں لیکن اُنیسویں صدی کے بعض
ماہرین لسانیات نے زبردستی "نسل" کے تصوّر کو زبان سے بھڑا دیا۔ یہ قصّہ
اس طرح شروع ہوتا ہے کہ آریائی خاندانِ السنہ کی بنیاد پر ایک فرضی آریائی
نسلی خاندان، ایک فرضی آریائی نسل کی بنیاد رکھی گئی۔

"آریائی" یا "ہند یوروپی" السنہ کا خاندان یورپ اور ایشیا کے
بڑے حصّے میں پھیلا ہوا ہے۔ شمالی ہندستان، ایران اور افغانستان
کی زبانیں، اور یورپ میں ہنگری، فنستان، استھونیا، لیپ لینڈ، باسک
اور ترکی کے سوا باقی تمام علاقوں کی زبان کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔

تمام زبانوں میں جو اس خاندان السنہ میں شامل ہیں چند الفاظ
ایسے ہیں جو ایک ہی جڑ سے نکلے ہیں اور اکثر و بیشتر ہند یوروپی زبانوں
میں ایسے مشترک الاصل الفاظ موجود ہیں جو دوسری زبانوں سے اپنا

---

[1] Foxe's "Book of Martyrs".

رشتہ صاف صاف ظاہر کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر چند اعضا کے لیے جو الفاظ اُردو میں ہیں اُس سے ملتے جلتے الفاظ (جن کی جڑ ایک ہی ہے) تقریباً تمام ہندیورپی زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً "گھٹنا" "پاؤں" "دانت" وغیرہ۔

ایک سے لے کر دس تک اعداد کے نام بھی ہندیورپی زبانوں میں مشترک الاصل ہیں۔ اسی طرح قریبی رشتہ داروں کے نام جیسے باپ (پدر) "ماں" "دختر" "خواہر" بھائی (برادر) "بھتیجہ" وغیرہ تمام ہندیورپی زبانوں میں ایک ہی جڑ سے نکلے ہیں۔

اسی طرح بہت سے پالتو جانور مثلاً گائے وغیرہ کے نام اور اُن سے متعلقہ چیزیں جیسے "اُون" مشترک الاصل ہیں۔ زراعت اور باربرداری کے متعلق بھی بہت سے الفاظ ہم اصل ہیں۔ دھات کے لیے بھی ایک لفظ ایسا ہی جو سب زبانوں میں عام ہے (جس سے انگریزی لفظ ORE مشتق ہے) سمندر اور مچھلی کے لیے الفاظ نہیں ملتے لیکن ملاحی سے متعلق مشترک الاصل الفاظ ملتے ہیں۔ "دروازہ" کے لیے ہم اصل الفاظ ان سب زبانوں میں پائے جاتے ہیں اور جھونپڑیوں کی دوسری ضروریات سے متعلق بھی بعض بعض درختوں کے نام ہم اصل ہیں۔ اسی طرح "بھالو" "اودٹر" "موش" "پر" وغیرہ کے لیے "رات" اور "ستارے" کے لیے بھی ایک ہی جڑ کے الفاظ ان تمام زبانوں میں موجود ہیں۔

ایک ہزار سال قبل مسیح سے پہلے آریائی (ہندیورپی) زبانیں بولنے والے لوگوں کی تاریخ کا ہم کو کوئی علم نہیں لیکن جس زمانے کی یادگار مندرجۂ بالا الفاظ ہیں وہ اس سے بھی ہزار سال پہلے کا ہے اور اگر کوئی ذریعہ ہندیورپی زبان بولنے والی قوموں کے متعلق خیال آرائی کرنے کا ہے تو

"آریائی" ہندیورپی زبانیں

قدیم ہندیورپی زبانیں

- ہندایرانی
  - سنسکرت
    - پراکرتیں
      - مرہٹی
      - پنجابی
      - بنگالی
      - اُردو
      - ہندی
      - اُڑیا
      - گجراتی
      - کشمیری
      - دیگر السنہ
  - پالی
  - پہلوی
    - فارسی
    - پشتو
- جپسی
- بالٹک
  - لیٹی
  - لتھونی
- آرمینی
- تخاری (وسط ایشیا)
- البانی
- قدیم یونانی
  - جدید یونانی
  - اور شاخیں
- اطالی
  - لاطینی
    - اطالوی
    - پرووانسال
    - فرانسیسی
    - ہسپانوی
    - پُرتگالی
    - رومانوی
    - مزید شاخیں
- بالٹوسلافی
  - رُوسی
  - بلغاروی
  - سربی
  - پولستانی
  - چیک
  - مزید شاخیں
- کیلٹی
  - ائرس
  - گیلک
  - مانکس
  - برٹین
  - ویلش
  - کارنش
- جرمانی
  - مشرقی جرمانی شاخ (گاتھک)
    - گاتھی
    - برگنڈی
    - وِندالی
  - شمالی جرمانی شاخ (اسکینڈی نیوی)
    - سویڈی
    - پرانی ناروستانی
    - ڈے نش
    - آئس لینڈک
  - مغربی جرمانی شاخ (ٹیوٹانک)
    - ڈائچ
      - ہائی جرمن
        - جرمن
      - لوجرمن
        - ڈچ
    - اینگلوفریزی
      - فریزی
      - قدیم انگریزی (اینگلوسیکسن)
        - انگریزی
- چند اور قدیم السنہ

صرف ایسے چند الفاظ ہیں۔

ان الفاظ کی روشنی میں ہم صرف اس حد تک یقین کے ساتھ کہ سکتے ہیں کہ اب سے چند ہزار سال قبل کوئی گروہ ایسا ہوگا جو ایک ایسی زبان بولتا ہوگا جس سے ہندیورپی خاندان کی تمام زبانیں نکلی ہیں۔ یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ جو قومیں آج ہندیورپی شاخ کی زبانیں بولتی ہیں وہ نسلاً بھی اس گروہ کی اولاد میں ہیں جو قدیم ہندیورپی زبان بولتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندیورپی زبانوں کے مشترک الفاظ ایک قدیم تمدّن[1] کی طرف ضرور اشارہ کرتے ہیں جن سے تمام ہندیورپی بولنے والی زبانیں مستفید ہوئیں۔ یہ تمدّن چراگاہوں کا تھا۔ قدیم ہندیورپی بولنے والے لوگ اپنے جسم کے اعضا کا الگ الگ نام رکھ چکے تھے۔ وہ گنتی گن سکتے تھے، اپنے قریبی عزیزوں کو جدا جدا ناموں سے پکارتے تھے، جھونپڑیوں میں رہتے تھے، پالتو جانوروں کے علاوہ چند وحشی درندوں اور چند چھوٹے تکلیف دہ جانوروں (جیسے چوہوں) سے بھی انھیں سابقہ پڑ چکا تھا۔

لیکن مشترک زبان یا مشترک تمدّن اور مشترک نسل میں بہت بڑا فرق ہی۔ ایک ہی زبان بولنے والوں کا ایک نسل سے ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بسا اوقات فاتح قوم مفتوح اقوام پر اپنا تمدّن اور اپنی زبان زبردستی عاید کرتی ہی۔ مثال کے طور پر تاریخ انگلستان میں ہمیں دوبار اس کی نظیر ملتی ہی۔ جب اینگلوسیکسن اقوام نے انگلستان کو فتح کیا تو انگلستان کی اصل

---

[1] Logan Pearsall Smith: The English Language.

کیلٹک قسم کی زبان اور پرانے تمدن کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح جب نارمنوں
نے ۱۰۶۶ء میں انگلستان فتح کیا تو اپنی زبان اور اپنا تمدن ملک پر زبردستی
عاید کرنا چاہا۔ کچھ عرصے تک وہ اس کوشش میں مصروف رہے لیکن انگریزی
زبان اس مرتبہ فنا نہیں ہوئی اور ان کا تمدن اور قدیم انگریزی تمدن مل کے
ایک نیا تمدن پیدا ہوا۔

بسا اوقات اس کے برعکس یہ عمل ہوتا ہے کہ اگر مفتوح قوم زیادہ متمدن
ہو یا اس کی زبان زیادہ شیریں اور ترقی یافتہ ہو تو فاتح قوم اس کا تمدن
یا اس کی زبان اختیار کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر ہلاکو کی اولاد ایلخانی شاہوں
نے اپنی تاتاری زبان چھوڑ کے بہت جلد فارسی زبان اختیار کر لی۔

ہندستان کے مسلمان فاتحین میں سے اکثر کی مادری زبان ترکی تھی،
لیکن سب نے فارسی کو اپنی درباری زبان بنایا۔

بہر حال اگر بہت سی قومیں ایک ہی زبان بولیں تو کسی طرح ثابت
نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی نسل سے ہیں۔ اس کے برعکس اس کا امکان ہے کہ
ان میں فاتح مفتوح کا ایک محض ہمسایگی کا تعلق رہا ہو۔[۱]

اس طرح آریائی یا ہند یورپی زبانوں کی بنیاد پر آریائی نسل کا جو
افسانہ گھڑا گیا اس کی کوئی اصلیت نہیں اور اب تو اسے عام طور پر غلط قرار
دیا گیا ہے۔

بہت سے حضرات نے قدیم ترین آریائی زبان بولنے والوں کا
وطن وسط ایشیا قرار دیا ہے بعض نے روس کی چراگاہوں اور بعض جرمن
ماہرین لسانیات نے ان کا وطن شمالی یورپ قرار دیا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ

---

[۱] Otto Jespersen: On Language.

لسانی اور نسلی نقطۂ نظر سے اس کی ذرا بھی اہمیت نہیں ہے کہ یہ گروہ کہاں بستا تھا۔

"آریائی نسل" کے نظریے کی تعمیر اور تخریب کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ "ہند یورپی" زبانوں کے تعلق پر سب سے پہلے ایک فرانسیسی ماہر لسانیات کوردوکس Courdoux نے تحقیق کی اگرچہ اس کی تصنیف چالیس سال کے بعد شایع ہوئی۔

اسی درمیان ۱۷۸۳ء میں سر ولیم جونس کلکتہ کی عدالت العالیہ کے میر مجلس مقرر ہو کے ہندستان پہنچے۔ انھوں نے ہندستانی زبانوں کا مطالعہ شروع کیا اور سنسکرت اور یورپ کی دوسری زبانوں کے تعلق پر روشنی ڈالی۔ سر ولیم جونس ہی نے لفظ "آریا" کو یورپی زبانوں میں رواج دیا۔ انھوں نے اس لفظ کو محض لسانیاتی معنوں میں استعمال کیا تھا اور اس میں کہیں نسل کا تصور نہیں تھا لیکن بہت جلد اس کے معنی مسخ ہونے لگے۔

لفظ "آریا" کے معنی "عالی مرتبت" ہیں اور یہ لفظ عموماً دیوتاؤں سے منسوب کیا جاتا تھا، یہ لفظ سنسکرت اور ژند دونوں زبانوں میں استعمال ہوتا تھا اور ان زبانوں کے ذریعے لفظ آریا یا اس کے مشتقات جدید ہندستانی زبانوں اور فارسی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ہندستان میں لفظ آریا مذہبی معنوں میں استعمال ہوتا تھا اور اُن لوگوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جو برہمنوں کے دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ شمالی ایران کے میڈ Medes. اپنے آپ کو آریا کہتے تھے[۱]۔ ان کے چھ قبیلوں میں سے ایک کا نام یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے اور اری زن توس لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے

۱۔ Z. A. Ragosin : Media (The Story of the Nation Series).

کہ یہ لفظ نہ صرف ہندستان اور ایران بلکہ یونان میں بھی رائج تھا، یونانی اس کو مشرق کے باشندوں کے ایک خاص قبیلے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح رومۃ الکبریٰ کی سلطنت کے زمانے میں وہ علاقہ جو اب خراسان اور افغانستان کہلاتا ہے "ایریانا" ' A. Riana. کہلاتا تھا۔ اسی لفظ "ایرانا" سے "ایران" مشتق ہے۔

سر ولیم جونس نے جس کام کو شروع کیا تھا وہ یورپ میں اور خصوصاً جرمنی میں جاری رہا اور اس خاندان کی زبانوں کو "آریائی" زبانوں یا "ہند یورپی" زبانوں یا ہند جرمانی زبانوں کا لقب دیا گیا۔

اٹھارویں صدی کے ختم اور انیسویں صدی کے شروع میں جرمنی کے رومانی اسکول کے مصنفوں کو مشرقِ وسطیٰ اور خصوصاً ہندستان و ایران کی زبانوں اور ادبیات سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ان مصنفوں میں سب سے پیش پیش فریدرش فان شلے گل تھا۔ فریدرش فان شلے گل نے خود بھی سنسکرت زبان سیکھی اور اپنے بھائی آگست وِلہلم فان شلے گل کو بھی اس کا شوق دلایا۔ ۱۸۱۸ء میں آگست وِلہلم، جرمنی کی بون یونیورسٹی میں سنسکرت کا پروفیسر مقرر ہوا۔ یورپ میں وہ سنسکرت کا پہلا پروفیسر تھا۔ فریدرش فان شلے گل نے سب سے پہلے تقابلی قواعدِ زبان کے امکانات پر زور دیا اور اس کی کتاب Ueber die Sprache und Weisheit der Inder. بہت مقبول ہوئی۔

یورپ اور خصوصاً جرمنی کے لسانیاتی محققین مزید تحقیق میں مصروف رہے۔ ان میں سے راسک (Rask.) نے خصوصیت سے اس امر پر بحث کی کہ زبان کو اس کے قواعد کی بنا پر جانچنا چاہیے۔ اس کے

قواعد کی بنا پر جانچنا چاہیے۔ اس کے الفاظ کی بنا پر نہیں۔ راسک نے ہندستان کا سفر بھی کیا اور پہلی مرتبہ اس امر کو ثابت کیا کہ ڈراویڈی زبانیں آریائی خاندان سے تعلق نہیں رکھتیں۔

گرم Grimm. نے ان اصولوں کو پہلی بار مرتب کیا جس کی بنا پر صوتیاتی طور پر جرمانی زبانیں ہند یورپی زبانوں کے عام گروہ میں علیحدہ ہو کر ایک جُدا شاخ بن جاتی ہیں۔

لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے ہمبولٹ کا نام بہت اہم ہے۔ اس جرمن محقق نے "زبان" اور "انسانوں" کے باہمی تعلق پر بحث کی اور آوازوں اور خیالات میں ایک طرح کا تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "زبان" اور "نسل" کے تعلق کے نظریے کی ایک طرح سے یہیں سے ابتدا ہوتی ہے۔

جس کام کی احتیاط کے ساتھ ہمبولٹ نے ابتدا کی تھی اس کو ایک جرمن محقق شلائشر نے بڑے جوش خروش سے، اور احتیاط کا لحاظ رکھے بغیر کرنا شروع کیا۔ شلائشر نے علم لسانیات کو ایک طرف فلسفے اور دوسری طرف سائنس سے زبردستی جا ملایا۔ شلائشر کا دعویٰ تھا کہ نسلوں کی تقسیم کی بنیاد زبان پر ہونا چاہیے اور دوسرے معیاروں یعنی رنگ یا سر کی وضع یا بالوں کی وضع یا بالوں کے رنگ پر نہیں۔ شلائشر نے زبانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا تھا۔

(۱) علیحدگی پسند زبانیں

(۲) چسپیدگی اختیار کرنے والی زبانیں

(۳) "گردان" والی زبانیں

انھیں نام نہاد لسانی گروہوں کی مناسبت سے اس نے نسلوں کی

تقسیم کی تھی۔

شلائی شر کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہی کہ اس نے قدیم ترین "آریائی" یا "ہندیورپی" زبان کو مکرر ترتیب دینے کی کوشش کی اور اس زبان میں ایک چھوٹی سی کہانی بھی لکھی[1]۔ اگرچہ کہ وہ خود اپنے مفروضات میں حدِ احتیاط سے تجاوز کر گیا تھا لیکن "مکرر ترکیب" پر ہی آج بھی تقابلی قواعدِ السنہ کا دارومدار ہی۔

شلائی شر کے خیالات کو لسانیات کے ایک اور ماہر بیون سن نے فروغ دیا جو ۱۸۴۱ء سے لے کر ۱۸۵۴ء تک دربار انگلستان میں پروشیا کا سفیر بھی تھا۔ ۱۸۴۷ء میں بیون سن نے برٹش اسوسی ایشن کے ایک جلسے میں "زبان" اور "نسل" اور اس طرح علم لسانیات اور علم الانسان کے باہمی تعلق پر زور دیا۔ اس وقت تک ڈارون کی کتابیں شایع نہیں ہوئی تھیں لیکن بیون سن نے انسان اور حیوانات کے تعلق پر زور دیا اور انسان اور حیوان کے درمیان باعث فرق محض زبان کو قرار دیا۔ زبان ہی ایسی چیز ہی جو انسان کے سوا کسی اور جانور کو حاصل نہیں ہو سکتی یا کم از کم اب تک

[1] اُن ناظرین کے لیے جنھیں لسانیات سے دلچسپی ہی ہم شلائی شر کی "ہندیورپی" کہانی کا ایک حصہ درج کرتے ہیں۔

Avis Jasmin Varna Na A Ast. Dadarka, Akrams, Tam, Vagham Garum, Naghantam, Tam, Bharam, Magham, Tam, Manun, Aku Bharantam, Avis Akvabhajuins, AVarakat, Kard Aghnutai Mai Vidlanti Manun Akvams Agantam.

حاصل نہیں۔ بیون سن کی ساری بحث کا مقصد یہ تھا کہ بنی نوع انسان کی تقسیم بلحاظ السنہ ہونی چاہیے[1]۔ لسانیات اور علم الانسان کے اس ناجایز تعلق سے جو غیر سائنٹیفک سائنس وجود میں آئی تھی وہ اس زمانے میں "لسانیاتی انسانیات" کہلاتی تھی۔

لیکن "زبان" اور "نسل" کے اس "ناجایز تعلق" میں سب سے زیادہ مورد الزام فریدرش میکس مُلر کو قرار دیا جاتا ہی، اگرچہ یہ الزام ایک حد تک غلط ہی۔ ایک زمانے تک میکس مُلر نے شلائیشر اور بیون سن کے خیالات کو وسعت دی اور انھیں ایک مقبول اور عام فہم پیرائے میں پیش کیا۔ لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اصطلاح "آریائی" کو رواج دیا۔ اس اصطلاح کو اختیار کرنے کا باعث میکس مُلر کے دو مفروضات تھے۔ ایک تو یہ کہ "ہند ایرانی" شاخ تمام "آریائی" زبانوں میں پُرانی ہی اور چونکہ وہ خود اپنے وطن میں آریائی کہلاتی ہی اس لیے تمام زبانوں کو جو اس خاندان سے ہیں آریائی کہلانا چاہیے۔ اب اس مفروضے کی تردید ہو چکی ہی اور ثابت ہو چکا ہی کہ سنسکرت زبان یونانی کے مقابلے میں ایسی زیادہ قدیم نہیں ہی۔ میکس مُلر کا دوسرا مفروضہ یہ تھا کہ قدیم ترین آریائی زبان نے جس خطے میں پرورش پائی وہ وسط ایشیا کا وہی حصہ ہو گا جس کو اہل روما ایریانا (ایران) کہتے تھے۔ یہ نظریہ بھی بالکل غلط نہیں ثابت ہوا، لیکن اس کی صحت کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض محقق کہتے ہیں کہ روس کی چراگاہوں[2]

---

[1] Report of the 17th meeting of the British Association. (London 1847).

[2] *Logan Pearsall Smith:* The English Language.

میں اس قدیم ترین "آریائی" یا ہند"یورپی" زبان نے پرورش پائی ہوگی اور حال ہی میں ایک نیا نظریہ یہ قایم کیا گیا ہی کہ "آریائی زبان" (اور "آریائی نسل") کا اصلی وطن بالٹک اور بحر شمالی کا ساحل تھا۔[1]

میکس مُلر نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ پہلی مرتبہ آریائی زبانوں کی بنیاد پر "آریائی نسل" کا نظریہ قایم کیا۔ خود میکس مُلر کو اپنی غلطی بہت جلد معلوم ہوگئی اور تمام عمر اس نے اس کی تلافی کی کوشش کی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، انیسویں صدی کا یورپ جو نسلی امتیاز کے بہانے ڈھونڈھ ہی رہا تھا اُسے ایک اچھا بہانہ ہاتھ آگیا۔ میکس مُلر کے اس غلط نظریے کو فرانس میں گوبی نو Gobineau. اور جرمنی میں کوزی نا Kossinna. نے اُڑے اور "نسل" کے نظریے زور پکڑتے گئے۔ انگلستان کے بعض قابل ترین ادیبوں مثلاً کارلایل اور چارلس کنگسلے نے بھی "آریائی نسل" کا ذکر کیا ہی۔ انتہا ہوگئی کہ باوجود جدید ترین تحقیقات سے واقف ہونے کے مسٹر ایچ۔ جی ویلز نے اپنی تاریخِ عالم میں بھی آریائی زبان بولنے والوں کو "آریائی نسل" قرار دیا ہی۔

میکس مُلر نے جن غلط نظریوں کو رواج دیا تھا ان کی تردید کی خود اس نے سب سے زیادہ کوشش کی۔ "عجیب بات یہ ہی کہ اکثر مجھی کو اس نظریے کا سب سے زبردست حامی سمجھا جاتا ہی جس کی اب میں اس شدت سے تردید کر رہا ہوں۔ غالباً ایک حد تک میں خطاوار بھی ہوں کیونکہ میں نے اکثر آریائی نسل یا سامی نسل کا ذکر کیا ہی مگر اس سے میرا اشارہ محض اُن لوگوں کی طرف تھا جو آریائی زبانیں یا سامی زبانیں بولتے ہیں۔[2]

---

[1] Gustav Kossinna: "Die Deutshe vorgeschichte, eine hervorragend National wissenschaft."

[2] حاشیہ صفحہ ۳۷ پر

"۱۸۵۳ء میں بیون سن کے نام "تورانی زبانیں" کے عنوان سے میں نے ایک خط لکھا۔ ایک باب میں جس کا عنوان 'النسانیات بنام لسانیات' تھا میں نے مطالبہ کیا کہ لسانی تحقیق اور النسانیات کی تحقیق کو اگر ایک دوسرے سے کامل طلاق نہ بھی دلائی جائے تو کم از کم قانوناً ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دینا چاہیے"

"میں اعلان کر چکا ہوں کہ کسی کھوپڑی کو آریائی قرار دینا ایسی ہی وحشت ناک حماقت ہوگی جیسے کسی "ڈے لی کوسی فالک" (لمبے اور تپلے سروالی) زبان کا تذکرہ"

"جہاں تک ہم کو قدیم آریائی، سامی اور تورانی زبانوں کا علم ہے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ بیرونی الفاظ ان سب میں مستعار لیے گئے۔ جب ہمیں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ آریائی، سامی اور تورانی زبانیں بولنے والوں کے آباو اجداد ایک دوسرے کے قریبی ہمسائے تھے تو کیا اُن میں امن کے زمانے میں آپس میں شادیاں نہ ہوتی ہوں گی اور کیا جنگ کے زمانے میں وہ مردوں کو مار کے عورتوں کو پکڑ نہ لے جاتے ہوں گے؟

"لسانیات کے طالب علم جب آریوں کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کا مطلب اُن لوگوں کا ذکر ہوتا ہے جو آریائی زبانیں بولتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

حاشیہ صفحہ ۳۵ و ۳۶: *F. Max Mueller*: On the Classification of Mankind by Language, or by Blood ("Chips from a German work. shop"). Vol. 1.

"آریا وہ لوگ ہیں جو آریائی زبانیں بولتے ہیں، چاہے ان کے جسم کا رنگ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ یا اُن کا خون کچھ ہو۔ اُن کو آریا کہنے سے ہمارا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کے زبان کی گرامر آرین (آریائی) ہے[1]"

"مقدس قانونی کتابوں سے ہمیں دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ محض یہ امر کہ ان میں مختلف نسلوں کے لوگوں میں باہم شادی بیاہ کرنے کی ممانعت ہے، شہادت دیتا ہے کہ فطرت انسانی ان احکامات سے زیادہ زبردست تھی۔ قانون میں ممانعت ہو یا اجازت لیکن باہمی شادیاں اور بیاہ ہمیشہ ہوتے رہے[2]"

علم انسانیات کے ایک ماہر ہورشیو ہیل نے اس بنا پر کہ ڈراویڈی زبانوں کی قواعد اور آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کی زبان کی قواعد میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں اور اس کے علاوہ دوسری بنیادوں پر ڈراویڈی نسل اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی نسل میں تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کی میکس مُلر کے اس نظریے سے تشفی نہیں ہوئی کیونکہ اس کا دارومدار زیادہ تر زبان پر تھا[3]۔

جہاں سچے علم دوست علما نے میکس مُلر کی اس ترمیم کو پسند اور اختیار کیا، وہاں انیسویں صدی کے یورپ کے وہ نمایندے جو نسلی برتری

---

[1] رسالہ F. Max mueller : Letter to Mr. Risley.

(ohips Vol 1.)

[3] F. Max mueller : Horatio Hale on the True basis of Anthropology ("Chips" Vol. 1.)

ثابت کرنے کے بہانے ڈھونڈتے تھے۔ میکس مُلر کے پُرانے نظریوں پر اڑے رہے لیکن اب تو جرمنی کے سوا باقی دنیا بھر میں "آریائی نسل" کی کہانی گاؤ خورد ہو چکی ہے اور زبان کو علم الانسان یا انسانیت کی تحقیق میں زیادہ دخل نہیں۔ اگر کوئی دخل ہے بھی تو اس حد تک کہ زبان سے بعض وحشی اقوام کے تمدن کے مطالعے میں مدد ملتی ہے۔

انیسویں صدی میں جب یورپ کی ملک گیری اور شہنشاہی نے پروپاگنڈے[1] کے لیے اور بہت سے ذرایع اختیار کیے تو اُن میں سے ایک نسل کا نظریہ بھی تھا۔ نسل کے نظریے کے معنی اب یہ ہونے لگے کہ بعض نسلیں طبعاً پست اور ادنیٰ درجے کی ہوتی ہیں اور اعلیٰ درجے کی نسلوں کا فرض ہے کہ ان کو تعلیم دی جائے۔ نسل کی بنیاد کبھی رنگ پر رکھی گئی اور کبھی زبان پر۔ "آریائی نسل" کے غلط نظریے کو بھی خوب فروغ ہوا۔

بعض نسلوں کی طبعی اور فطری پستی کا غلط نظریہ سب سے پہلے ایک فرانسیسی امیر ژوزف گوبی نو نے پیش کیا۔ اپنی کتاب "انسانی نسلوں کی عدم مساوات پر مقالہ"[2] میں جو ۱۸۵۵ء میں شایع ہوئی اس نے نام نہاد "آریائی نسلوں" کی برتری کا دعویٰ کیا۔ ایک اور فرانسیسی لاپوژ نے اپنی تصنیف "لارین" L'aryen. میں اور زیادہ مبالغے سے کام لیا اور "آریائی" نسل اور "نارڈک" نسل کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی۔

جرمنی میں مشرقی پروشیا کے ایک شخص گستاف کوزی نا نے

---

[1] *P. T. Moon* : Imperialism and World Politics.

[2] Essai Sur Linegalite Des Races Humaines.

"نسل" کے اس تصور اور قدیم جرمنی کے آثار قدیمہ میں تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کوزینا نے ماقبل تاریخ علوم کو ایک طرح کا قومی فن قرار دیا۔ یہ اس کی کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس شاہکار کا نام ہے **Die Deutsche Vorgeschichte eine hervorragend Nazionale Wissenschaft.** ہے۔ کوزینا کے نزدیک "نارڈک" یا "جرمانی" یا "آرین" ہم معنی ہیں۔ اور جرمنوں کے علاوہ اہل اسکنڈی نیویا بھی آریائی یا نارڈک کہلانے کے مستحق ہیں۔

"آریائی نسل" کا "نظریہ" نارڈک نسل کے نظریے میں ضم ہوتا گیا جب ہم انیسویں صدی کی سرمایہ دارانہ شہنشاہی کے پروپاگنڈے کا مطالعہ کریں گے تو اس کی مزید تفصیلات سے سابقہ پڑے گا۔

(۳)

ہندستان میں ہمیں "نسل" کا تصور سب سے پہلے سیاسیات کی روشنی میں ملتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ذات پات کی تقسیم میں "نسل" کے تصور کا استعمال کیا گیا۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ ذات پات کی تقسیم نسل کی بنیاد پر نہیں بلکہ نسل کے ایک فرضی اور غلط معیار پر ہوئی۔[1]

اس امر کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ آریائی زبان بولنے والی قوموں میں شروع میں کسی طرح کی ذات پات کی تفریق اور تمیز نہیں تھی۔ ہندستان سے باہر میڈی قبایل میں آریائی اور غیر آریائی دونوں طرح کے قبایل شامل تھے۔ ہیروڈوٹس نے ان کے جو نام نقل کیے ہیں اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن میں سے صرف ایک قبیلہ اپنے آپ کو

---

[1] *Hermann Schneider :* **The History of World Civilization (Vol. II).**

"آریائی" کہتا تھا۔ لیکن بہت جلد یہ تمام قبایل گھُل مل گئے[1] اور ایک عام نام "میڈ" Mede. سے وہ آج تک مشہور ہیں۔ ان کے پجاریوں کا طبقہ یعنی مَغ Magi. غالباً غیر آریائی تھا[2]۔

میڈیا کی طرح ایران خاص کی آبادی بھی نسلوں کے لحاظ سے بہت ملی جلی تھی[3]۔ اگر پہلے آریائی زبان بولنے والے فاتحین اور وہاں کے باشندوں میں کوئی امتیاز تھا بھی تو بہت جلد رفع ہو گیا۔

اگر میڈیا اور ایران میں آریائی زبانیں بولنے والی قومیں مختلف النسل باشندوں سے گھُل مل گئیں تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ہندستان میں بھی ایسا کیوں نہیں ہُوا ہوگا واقعہ یہ ہے کہ ساتویں صدی قبل مسیح میں ذات پات کے سخت معیار کے قایم ہونے اور "کالے اصلی باشندوں" سے تعصب پیدا ہونے سے پہلے ان کا اصلی باشندوں سے ضرور شادی بیاہ اور میل ملاپ ہُوا۔ یہاں تک کہ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ذات پات کا ابتدائی خاکہ بھی آریوں نے ڈراویڈی لوگوں ہی سے اُڑایا۔ ڈراویڈی تمدّن سے آریوں نے بہت کچھ سیکھا اور اگرچہ اپنی زبان ان کی آبادی کے بعض طبقوں پر عاید کردی لیکن نام نہاد آریائی تمدّن پر جتنی تحقیق ہوتی جا رہی ہے ڈراویڈی اثر ثابت ہوتا جا رہا ہے۔ انیسویں صدی میں یورپ کے "آریائی" اصل سے ہونے سے نظریے مقبول ہوئے تو ہندستانیوں کو بھی فخر کرنے کا موقعہ ملا ان کا تعلّق اس نسل کی قدیم تر شاخ سے ہے۔ اسی بنیاد پر اس زمانے میں کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے قابل ذکر

---

[1] و [2] و [3] Z. A. Ragosin : Media.

رومیش چندردت کی کتاب ہے[۱]۔ اس میں ذات پات کی بنیاد کا جو نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ اگرچہ بہت دلچسپ ہے لیکن جدید ترین تحقیقات اُسے قبول نہیں کرتی۔

اب یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ بعض ڈراویڈی زبانیں سنسکرت زبان سے بھی بہت زیادہ پُرانی ہیں۔ ہندستان کے آثار قدیمہ ڈراویڈی تمدن کی عظمت اور پختگی کی گواہی دے رہے ہیں۔ اس لیے اس امر سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب آریائی بولنے والے گروہوں نے ہندستان پر حملہ کیا تو ایک ایسی قوم کو اس ملک میں آباد پایا جو اُن سے زیادہ متمدن تھی اور اس قوم سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ ان چیزوں میں جو انھوں نے مفتوح قوم سے سیکھیں غالباً مذہب بھی تھا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ میڈیون کا پجاری طبقہ "مغ" آریائی زبان بولنے والا طبقہ نہیں تھا۔اسی طرح ہندستان کا پجاری طبقہ یعنی "برہمن" بھی غالباً ابتدا میں ڈراویڈی تھا۔آریوں کے آنے بلکہ ساتویں صدی تک پجاریوں کا یہ طبقہ "ذات" نہیں تھا۔سورج اور سانپ کے قدیم پُجاری مصر سے لے کر ہندستان تک پھیلے ہوئے تھے۔ سلیٹر[۲] کا نظریہ یہ ہے کہ مصر کے ہیلیو لتھک تمدن کے داعی ڈراویڈی لوگوں میں گھُلے ملے اور اس طرح برہمن وجود میں آئے۔ پروفیسر ایلیٹ اسمتھ نے سلیٹر کی اس رائے

---

[۱] *A. V. W. Jackson (ed. by).* History of India (Vol I. by Romesh Chande Dutt)

[۲] *G. Slater* : The Dravadian Element in India Culture.

سے اتفاق کیا ہے۔

جب آریائی زبان بولنے والے فاتحین نے ہندستان کا مذہب سیکھا تو ان ڈراوڈی برہمنوں یا پجاریوں کی توقیر کی ہو گی اور اُن سے اور دوسرے ڈراوڈی لوگوں سے شادی بیاہ بھی کیا ہوگا۔ لیکن چونکہ وہ بحیثیت فاتحین کے آئے تھے اس لیے سپاہی (جو چھتریوں کی ذات بن گئے) اس زمانے میں برہمنوں سے بہتر سمجھے جاتے ہوں گے۔ بلکہ اس لحاظ سے تو راجا (جنھوں نے پجاریوں اور بادشاہوں کی الگ الگ تقسیم عمل کے بعد دیوتاؤں کی اولاد سے ہونے کا دعویٰ کیا تھا) اپنے آپ کو برہمنوں سے برتر سمجھتے تھے۔ قدیم جادوگروں کے درجے سے پجاری اور راجاؤں دونوں نے ترقی کی تھی اور دونوں طبقوں میں شروع شروع میں رقابت ہو گی۔ طاقت کے زور پر پہلے تو راجاؤں اور سپاہیوں نے معاشرتی نظام میں اپنے لیے بہترین جگہ رکھی ہو گی۔ لیکن ہندستان کی سخت اور تیز و تند آب و ہوا، گرمیوں کی شدّت، وبائیں، بارش کے سیلاب، طوفان، قحط سالیاں، قدرت کی یہ سب سختیاں ایسی تھیں کہ پُجاری ہی اپنے منتروں سے اُن کا کچھ علاج کرسکتا تو کرسکتا۔ یہ راجاؤں اور سپاہیوں کی طاقت سے باہر تھے۔ وہم پرستی نے جو ہمیشہ سے فطرتِ انسانی کا بڑا جزو ہے۔ رفتہ رفتہ یہ سمجھ کر کہ پُجاری ہی (پُرانے جادوگر کی طرح) قدرت کی طاقتوں کا مقابلہ کرسکتا ہے، معاشرت میں پہلی جگہ اُسے دی اور راجاؤں کو (وہ دیوتاؤں ہی کی اولاد سے کیوں نہ سہی) اور سپاہیوں کو ثانوی جگہ ملی۔[۱]

اس زمانے میں ذات پات کا تصور بہت مدھم صورت میں نشو و نما تو پا رہا تھا لیکن اس نے وہ شکل نہیں اختیار کی تھی جو بعد میں

۱۔ Ibid.

اختیار کی۔

ڈراویڈی سوسائٹی میں ایک اور چیز تھی جس نے ذات پات کی بنا میں شاید تھوڑا بہت حصّہ لیا۔ قدیم ہندستان میں بھی دنیا کے اور بہت سے حصّوں کی طرح تقسیم عمل کے رجحانات تھے۔ باپ کا ہُنر بیٹا اچھی طرح سیکھ سکتا ہی، اور بیٹے کے بعد پوتا، اس طرح پیشے موروثی بن جاتے ہیں۔ بعض پیشے ایسے گھناؤنے ہوتے ہیں کہ چھوت چھات کا بھی امکان ہو سکتا ہی۔ لیکن یہ ہندستان میں کوئی ایسی انوکھی چیز نہ تھی اور محض اس کو ذات پات کی بنیاد قرار دینا زیادتی ہی۔

بہر حال قدیم ترین ڈراویڈی سوسائٹی میں غالباً "برہمن" موجود تھے۔ جنگجو آریائی زبان بولنے والے راجا اور سپاہی بن کے آئے۔ مگر مفتوحین سے تمدّن سیکھا، ان کو اپنی زبان سکھائی۔ آپس میں شادی بیاہ اور بہت زیادہ نسلی اختلاط ہوا۔

تو پھر ذات پات کا خیال کیونکر پیدا ہوا؟

ان جنگجو فاتحین کے اولین ادب کا ہم مطالعہ کریں تو دو متضاد چیزیں ملتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اوّل اوّل ان لوگوں میں آپس میں کسی طرح کی ذات پات کی تفریق نہیں تھی[1]۔ (اس سے اس نظریے کی تائید ہوتی ہی کہ ذات پات کا خیال ان کو ڈراویڈی نظام معاشرت دیکھ کر آیا) دوسرے یہ کہ ذات کے لیے لفظ "وارنا" سنسکرت میں استعمال ہوتا تھا جس کے اصل معنی "رنگ" کے ہیں۔ اس بنیاد پر اور رگ وید میں ہندستان کے اصلی

---

[1] A. V. W. *Jackson*: History of India (Vol. I by Romesh Chander Dutt).

باشندوں کا جس طور پر ذکر ہی اس پر نظریہ قایم کیا گیا کہ آریائی فاتحین نے اپنے آپ کو سیاہ فام ڈراویڈی اقوام اور اصلی باشندوں سے ممتاز رکھنے کے لیے ذات پات کے اصول قایم کیے۔ یہ نظریہ ایک زمانے میں یورپ میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ ہندستانی[1] بھی اسی کو مانتے تھے کیونکہ رگ وید میں سیاہ فام اصلی باشندوں کو بہت بُرا بتایا گیا ہی میکسمولر[2] نے اس نظریے کی تردید کی ہی کہ محض رنگ پر ذات پات کا مدار ہی کیونکہ جنوبی ہندستان میں بکثرت سیاہ فام برہمن آباد ہیں اور کوئی بھی ذات دوسری ذات سے باعتبار رنگ مختلف نہیں۔

یہ دو امور (۱) آریاؤں میں شروع میں ذات پات کا فرق نہ ہونا (۲) لفظ "وارنا" جو "آریائی" اور "غیر آریائی" میں فرق کرنے کے لیے استعمال ہوا، کے اصل معنی "رنگ" ہونا۔ بظاہر تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہندستان آتے ہی نام نہاد آریائی فاتحین نے اپنے آپ کو خالص رکھنے کی کوشش کی اور ذات پات کے ذریعے نسلی امتیاز کو باقی رکھا۔

لیکن تاریخ کا مطالعہ اور جدید ترین تحقیقات اس خیال کو غلط ثابت کرتی ہیں۔ پہلے تو یہ کہ "برہمن" طبقہ ڈراویڈیوں میں پہلے سے موجود تھا اور آریائی بولنے والے اُن کے شاگرد رہے۔

دوسرے یہ کہ رگ وید جس میں ہندستان کے اصلی باشندوں (غالباً جنوب اور وسط ہند کے ڈراویڈی باشندوں) کو غیر متمدن، سیاہ فام، وحشی قرار دیا گیا ہی؛ ساتویں صدی قبل مسیح میں لکھی گئی۔ ویدوں کے

---

[2] F. Max Mueller : Letter to Mr. Risley ("Chips", Vol. I.)

زمانے (ساتویں صدی قبل مسیح) سے قبل آریائی زبان بولنے والے فاتحین یقینی طور پر ڈراویڈی باشندوں سے بہت کچھ گھُل مل چکے ہوں گے۔ اس طرح جن برہمنوں نے اپنے "آریائی" ہونے کا افسانہ تصنیف کیا وہ خود مخلوط آریائی اور ڈراویڈی نسل کے تھے اور ذات پات نے "نسل" کو خالص تو کبھی بھی نہیں رکھا کیونکہ برہمنوں کو ہر ذات کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت تھی۔

دراصل ہوا یہ کہ آریائی بولنے والے فاتحین کو ہندستان میں پھیلنے کے لیے یہاں کے کہیں زیادہ متمدّن ڈراویڈی باشندوں سے (جن کا رنگ شمالی ہندستان میں غالباً اس زمانے میں بھی ایسا ہی ہوگا جیسا آج کل ہے) مسلسل لڑنا پڑا ہوگا اور وہ ان میں ملتے گئے ہوں گے۔ پروفیسر شنائیڈر[1] کے خیال میں یہ نسلی اختلاط ۱۲۰۰ء تا ۱۱۰۰ء قبل مسیح میں شروع ہوا ہوگا اور دریائے گنگا کی وادی میں اس کا سب سے زیادہ موقع ملا ہوگا۔ کیونکہ وہیں ۱۰۰۰ء ق۔م کے بعد ویدی تمدّن کی ابتدا ہوئی۔ تمام اعلیٰ درجے کے متمدّنوں کی طرح اس ویدی تمدّن کی بنیاد مذہب پر تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُسی طرح کی روایت بھی پھیلی جو یہودیوں میں پھیل چکی تھی۔ یعنی ان لوگوں نے اپنے آپ کو خاصان خدا تصوّر کیا جن کے لیے خدا نے اپنی نعمتیں بنائی تھیں۔ بزعم خود خدا کے یہ خاص بندے کوہستان کو عبور کرکے ہندستان آئے، پنجاب اور پھر گنگا کی وادی کو عبور کیا اور یہاں سلطنتیں قایم کیں۔ بندھیاچل کے جنوب

---

[1] Herman Schneider : The History of World Civilization (Vol. II)

کے باشندے (جو زیادہ تر موسم اور آب و ہوا اور شاید سیاہ تر قوموں سے میل جول کی وجہ سے) نسبتاً سیاہ فام تھے، ان نام نہاد آریاؤں" سے بل جُل چکے تھے، اس ملاپ کے بعد ہی اُنھوں نے سیاسی (نہ کہ نسلی) لڑائیوں کی بنا پر جا کر جنوب میں پناہ لی تھی، وہ ملیچھ اور نجس اور کالے قرار پائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح کے ویدی تمدن کے علمبردار ہندستان میں اپنے آنے اور ہندستانی تمدن سیکھنے کی اصلی کہانی بھول چکے تھے[1]۔ وہ یہ بھی بھول چکے تھے کہ اسی نام نہاد "سیاہ فام" ڈراویڈی قوم کا کتنا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ انھوں نے یہ فرض کر لیا کہ وہ شروع ہی سے ایک خالص نسل رہے ہیں اور اپنے آپ کو برگزیدہ اور ممتاز "آریا" سمجھنا شروع کیا۔ ذات پات کا مبہم سا غیر ترقی یافتہ شائبہ جو ڈراویڈی تمدن میں تھا اس کو اپنا حربہ بنا کے وادیٔ گنگا کی سلطنت کی بقا کے لیے انھوں نے ایک ایسے تمدن کی بنیاد ڈالی جس کی بنیاد نسلی امتیاز اور رنگ کے امتیاز کے مفروضات پر رکھی۔

اس طرح کا معاشی اور معاشرتی نظام قایم کرنے میں برہمنوں کا سراسر فایدہ تھا۔ نئے معاشری نظام میں انھیں اوّل ترین جگہ حاصل تھی۔ وہ خاصانِ خدا "آریائیوں" میں خاص الخاص تھے۔ مذہب، فلسفہ، قانون سب کی ترتیب اُن کے ہاتھ میں تھی۔ ایک طرف تو انھوں نے "رنگ" کو

---

[1] Herman Schneider: The History of World Civilization (Vol. II)..

جو شمالی ہندستان میں آسان ترین معیار ہو سکتا تھا ذات پات کا معیار ٹھیرایا۔ دوسری طرف ذات پات کے اصول کی مذہبی توجیہہ مسئلۂ تناسخ کے ذریعے کی۔ کسی شخص کا کسی ذات میں پیدا ہونا محض اتفاق نہ تھا بلکہ اس کے گزشتہ جنم کے گناہوں اور نیکیوں کا نتیجہ تھا۔

ذاتوں کی تقسیم میں چھتریوں (راجاؤں اور سپاہیوں) نے برہمنوں کا ساتھ دیا۔ یہ معاشرتی نظام معاشی طور پر ان کے لیے سُود مند تھا۔ وہ برہمنوں کی روحانی طاقت اور اس کے اثر سے مرعوب تھے اس لیے اگر برہمنوں نے اپنے لیے اس نظام معاشرت میں اوّلین جگہ لی تو اُس میں اُنھیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس کے علاوہ اگر برہمن اعیانِ مذہب تھے تو چھتری طبقہ اِس دنیا کے اعیان اور اُمرا کا تھا۔ اِن میں سے اکثر کا سلسلۂ نسب چاند اور سورج دیوتاؤں سے ملتا تھا۔ نظام معاشرت نے محکوم اقوام کو ان کا غلام بنا دیا تھا۔ پھر اُن میں سے کوئی کبھی کبھی برہمن بھی بن سکتا تھا جیسے وسوامِترا۔

ویش طبقہ جو ذات پات کے اس نظام میں تیسرا درجہ رکھتا تھا صنّاعوں اور زراعت پیشہ لوگوں کا تھا۔ زیادہ صحیح الفاظ میں ویش طبقے کے لیے یہ پیشے مقرّر کیے گئے۔ یہ طبقہ گو مذہبی اعتبار سے "آریا" سمجھا جاتا تھا اور اس کے افراد کو نجات کی امید رہتی تھی لیکن دراصل ملا جُلا یا مخلوط طبقہ تصوّر کیا جاتا ہو گا۔ کیونکہ فاتح قوم کے عوام مفتوح قوم میں زیادہ مل جُل جاتے ہیں۔ اور ان سے شادی بیاہ بھی کرتے ہیں۔ معاشی اور معاشرتی اعتبار سے ویش ذات کی آٹھویں صدی قبل مسیح میں غالباً وہ حیثیت ہو گی جو اینگلو انڈین یا متوطن ہند یورپین

طبقے کی برطانوی راج کی پہلی اور دوسری صدی میں رہی ہو۔ چند خاص (اور مقابلتاً اچھے پیشے) ان کے لیے مخصوص کر دیے گئے۔ ان کے ساتھ بہت سی رعایتیں کی گئیں۔ معاشی نقطۂ نظر سے اِس ذات کی سرپرستی اس لیے ضروری تھی کہ یہی کھیتی باڑی اور زراعت وصنعت کا کام کرتی تھی۔ چنانچہ مگاستھینز نے اس امر پر تعجب کیا ہے اور اس کی تعریف کی ہے کہ جنگ کے زمانے میں بھی کوئی ان سے تعرض نہ کرتا تھا۔ (لیکن میگاستھینز کا زمانہ وہ تھا جب ذات پات کے خلاف وہ ردّ عمل شروع ہو چکا ہوگا جس کی پیداوار اشوک تھا)

یہ تین ذاتیں شروع میں تین معاشی اور معاشرتی طبقے ہوں گی۔[1] اِس قسم کے طبقے یونان اور ایران میں بھی نمایاں ہوئے۔ لیکن تین ذاتیں نہیں بننے پائیں۔ جس چیز نے ان معاشرتی طبقوں کی ذاتیں بنایا وہ دراصل چوتھی ذات تھا، جس سے اجتناب اور احتراز لازم قرار دیا گیا اور یہ اجتناب اور احتراز رفتہ رفتہ تمام ذاتوں پر عاید ہوگیا۔ یہ چوتھی ذات شودروں کی تھی یعنی اُن "سیاہ فام" اصلی باشندوں اور مفتوحین کی، جن کا ذکر ہم رگ وید میں پڑھتے ہیں۔ شُدر وید نہیں پڑھ سکتے تھے۔ نہ انھیں مکتی حاصل ہو سکتی تھی نہ نروان، پہلی تین ذاتوں کے مقابلے میں وہ بدرجہا زیادہ حقیر تھے۔ وہ نیا تمدن جس نے انہی سے بہت کچھ سیکھا تھا انھیں مستقل طور پر معاشی مساوات یا سیاسی مساوات کے امکانات سے بہت نیچے گرا دینا چاہتا تھا۔

---

[1] Hermann Schneider: The History of World Civilization (Vol. II)

ذات پات کی اگر معاشی تاویل کی جائے تو ہمیں چار طبقے ملتے ہیں (۱) مذہبی پیشوا کا سیاسی طبقہ (۲) چھتری یعنی راجاؤں اور اُن کے اہالی موالی کا اشرافیہ طبقہ جیسے آج کل کی معاشرت کے اعلیٰ طبقے (۳) ویش یا شہری اور دیہاتی (۴) شُدر۔ غلام اور محکوم اقوام جیسے آج کل کے مزدور اور محکوم اقوام کے لوگ۔ اس نظام معاشرت میں بجز چوتھی ذات کے اور سب ذاتیں خوش تھیں۔ اس لیے یہ مقبول ہوا اور گوتم بدھ اور اشوک کی کوششوں کے باوجود یہ معاشی اور معاشری نظام فنا نہ ہو سکا۔[1]

اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ "ذات پات" کی بنیاد معاشی اغراض پر تھی جن کے لیے "نسل" کے غلط تصورات کو مذہب نے استعمال کیا۔ ویدی شعرا اس تصور کے لیے لوگوں کو عرصے سے تیار کر رہے تھے۔ جب یہ اصول معاشرت قایم ہو گیا تو اس کی مذہبی توجیہہ کی گئی۔

چاروں ذاتوں کے درمیان ہر طرح کے معاشرتی تعلقات ممنوع قرار دیے گئے تاکہ معاشی نظام قایم رہے اور "نسلی" اختلاط نہ ہونے پائے چنانچہ مختلف ذاتوں کے لوگ ایک ساتھ کھانا نہیں کھا سکتے۔ کیونکہ معاشرتی تعلقات، "نسلی" تعلقات کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔

معاشی حدِ فاصل رفتہ رفتہ محض مذہبی اور معاشرتی بن کے رہ گئی اور اگرچہ معاشی حالات بدل گئے لیکن ذات پات کی قید ابھی تک ہندستان میں قایم ہے۔ شمالی ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت کے دوران میں ذات پات کے نظام کی معاشی اہمیت بالکل صفر ہو گئی

---

[1] *Hermann Schneider* : The History of World Civilization (Vol. II)

اس کے علاوہ اسلام کی مساوات کا تصوّر ذات پات کی تفریق کے بالکل متضاد تھا۔ یہی وجہ ہی کہ شمالی ہندستان میں ذات پات کی قید اس قدر سخت نہیں جتنی جنوبی ہند میں ہی۔ اگر جنوبی ہند میں اب بھی ذات پات کی قید سخت ہی تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ذات پات کے اصول ڈراوِڈی لوگوں کے مرتّب کیے ہوئے ہیں "اور آریوں" سے ان کا کوئی تعلق نہیں (جیسا کہ سلیٹر کا خیال ہی) بلکہ اس کی وجہ یہ ہی کہ انگریزی حکومت کے قیام تک جنوبی ہند کا معاشی نظام وہی پُرانا تھا۔ گوتم بدھ اور اشوک اور اکبر کی کوششوں کا ہندستان کے اس جنوبی حصّے پر اثر نہیں ہوا۔[۵۱]

(۴)

اپنے آپ کو "خاصانِ خدا" سمجھنے کی ایک اور پُرانی تاریخی کہانی بہت دلچسپ ہی۔ ہندستانی آریائی بولنے والی قوم نے اسی وجہ سے ذات پات کا نظام مرتّب کیا اور اس پر عمل پیرا ہوئے۔ لیکن یہودیوں نے جب اپنے آپ کو "خاصانِ خدا" ٹھیرایا تو دنیا کو صرف دو ذاتوں میں تقسیم کیا۔ ایک تو خود نام نہاد بنی اسرائیل اور دوسرے ساری دنیا کے مُنکرین۔

یہودیوں کی "نسل" کبھی خالص نہیں رہی۔ "یہودا" اور "اسرائیل" دو قبیلوں کے مجموعے تھے۔ ان دو طرح کے سامی زبان بولنے والے قبیلوں میں سے ایک نے شمالی فلسطین اور ایک نے جنوبی فلسطین میں چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قایم کیں۔ ان میں سے یہودا کے دو بادشاہوں نے جو پیغمبر بھی سمجھے جاتے تھے ذرا شان وشوکت سے حکومت کی۔ یہ دو بادشاہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام تھے۔ لیکن ان

۵۱۔ *H. Schneider* : The History of World Civilization (Vol. I).

کی شان وشوکت جس کا توریت میں اس قدر فخر اور غالباً مبالغے سے ذکر کیا ہے اُسی دور کے فراعنۂ مصر یا شاہانِ بابل کی شان وشوکت کے مقابلے میں ہیچ ہوگی۔

بہت[1] سی مختلف نسلوں کے لوگ یہودا کی سلطنت میں گھُل مل کے ایک قوم بنے، یہودا کا قبیلہ شروع شروع میں آرامی زبان بولتا تھا۔ اس قبیلے کے ساتھ اور بھی بہت سے آرامی قبیلے تقریباً ۱۳۰۰ء قبل مسیح میں سرزمین فلسطین میں آئے ہوں گے۔ ان قبیلوں کے آنے سے پہلے فلسطین میں کچھ اصلی باشندے بھی تھے جو ایک کنعانی سامی زبان بولتے تھے، اور یہودیوں کے تمدن کے دور میں انھیں اصلی باشندوں کی زبان یہودیوں کی زبان بن گئی۔ اِس کے علاوہ حطّی اور مصری عناصر بھی فلسطین کی آبادی میں شریک ہوں گے۔

اس[2] کے بعد ایک بہت بڑا نسلی اختلاط اُس زمانے میں ہوا ہوگا جب بخت نصر مصریوں کو شکست دے کے فلسطین کے تمام یہودیوں کو اسیر کر کے بابل لے گیا۔ اسیریٔ بابل کا زمانہ تقریباً ۶۳۰ء قبل مسیح سے لے کر ۵۳۷ء قبل مسیح تک کا ہے۔ ۵۳۷ء میں اور اس کے بعد جب ایرانیوں نے بابل کی سلطنت فتح کی تو کیسرے اور ارتخششر اول نے یہودیوں کو بھی ان کے وطن واپس بھیجا اور اُن کو پوری مذہبی آزادی دی۔

پھر ایک اور بڑے نسلی اختلاط کا موقع اس وقت آیا جب ۳۲۵ء ق۔م سے ۳۰۰ء ق۔م کے عرصے میں مقدونیہ کے بادشاہ

---

[1] و [2] HERMANN SCHNEIDER: THE HISTOY OF WORLD (VOL. I)

سکندرِ اعظم نے ایران کی سلطنت کو فتح کیا۔ یونانی شام اور فلسطین میں بھی آباد ہوتے رہے۔ ایشیا کی بڑی یونانی (سلوسی) سلطنت کا مرکز ملکِ شام تھا۔ یونانی سلطنت کے زوال کے بعد فلسطین، رومتہ الکبریٰ کا ایک صوبہ بن گیا۔

اس لیے ان "خاصانِ خدا" کا یہ دعویٰ کہ ان کی "نسل" خدا کی منتخب کی ہوئی اور سب سے ممتاز ہے، کم ازکم تاریخی نقطۂ نظر سے تو غلط ہے۔ پھر یہودی صرف اصلی فلسطینی یہودیوں تک محدود نہیں رہے بلکہ یوکرین کے میدانوں میں ایک یہودی "خضر" سلطنت ایک بڑے زمانے تک قایم رہی جو تاتاریوں کے حملے کے بعد بالکل نیست ونابود ہوگئی۔ اس "خضر" کے یہودی باشندے جو غالباً اس زمانے میں بھی سلاف زبانیں بولتے ہوں گے۔ رُوس کی سلطنت میں اور پولینڈ میں منتشر ہوگئے اور روسی اور پولستانی یہودی زیادہ تر اُن لوگوں کی اولاد ہیں اور فلسطین کے یہودیوں سے ان کا بہت کم تعلق ہے۔

باوجود نسلی اختلاط سے انتہائی اجتناب کی کوشش کے، یہودیوں کے نسلی اختلاط کا اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے جس حصے میں بستے ہیں، اُن کی شکل وصورت دنیا کے اُس حصے کے عام باشندوں کی سی ہوتی ہے۔ بالٹک کے کنارے بسنے والے یہودیوں کے بال سُنہرے یا پیلے، اور اُن کی آنکھیں نیلی ہوتی ہیں اور ہندستان اور مصر کے یہودی ذرا سانولے ہوتے ہیں۔ کسی قسم کی مذہبی یا سماجی ممانعت نسلی اختلاط کو روک نہیں سکتی۔

حضرت سلیمانؑ اور بلقیس کی شادی خود اس امر کی گواہی دیتی ہے

کہ ابتدائی زمانے میں دوسری نسلوں سے شادی بیاہ پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ "نغماتِ سلیمان" میں اسی کا عکس موجود ہے۔

"اے[1] دختران یروشلم میں کالی ہوں لیکن خوبصورت،
جیسے کیدار کے خیمے، جیسے سلیمان کے پردے، مجھے چمک
کے نہ دیکھو کہ میں سیاہ فام ہوں۔ کیونکہ آفتاب مجھ پر چمک
چکا ہے۔"

ہندستان کے آریائی بولنے والے تمدن کی طرح یہودی تمدن کی بنیاد بھی مذہب پر تھی۔ انھیں اس بات پر فخر تھا کہ دنیا میں سب سے پہلے اُن کے پیغمبروں نے انسانوں کو خدا کی وحدت کا سبق دیا اور خدا کو واحد اور لاشریک لہٗ مانا۔

اسیریٔ بابل کے زمانے میں جب یہودیوں کو انتہائی ذلت اٹھانی پڑی تو اُنھیں احساسِ پستی کے ساتھ، ردّعمل کے طور پر اپنی عظمت کا احساس بھی ہوا۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے اپنے قدیم ادب کو اکٹھا کیا اور غالباً اِسی زمانے میں توریت کو باقاعدہ طور پر مرتب کیا۔ اِدھر اُنھوں نے بخت نصر کے دارالسلطنت میں بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔ اِس طرح جب ایرانی بادشاہوں نے یہودیوں کو بابل کی قید سے چھڑا کے فلسطین واپس بھیجا تو وہ اپنے آپ کو خدا کے برگزیدہ بندے اور "خاصانِ خدا" سمجھنے لگے تھے۔

عہد نامۂ قدیم کی کتاب اِسایا کے اُنچاسویں باب میں یہودیوں کے برگزیدہ اور خدا کے خاص بندے ہونے کا تقریباً اسی طرح ذکر ہے

---

[1] عہد نامۂ قدیم "نغماتِ سلیمان"، باب اوّل (۵، ۶)

جیسے ہٹلر کی کتاب "میری جدوجہد" میں نام نہاد "جرمن نسل" کا۔

"اے[1] جزیرے (والو) سُنو۔ اے دُور دراز کے لوگو کان لگا کے سُنو کہ خدا نے مجھے میری ماں کے رحم سے بُلایا، میری ماں کے پیٹ میں میرا ذکر کیا۔"

"اور اُس نے میرے مُنہ کو تیز تلوار کی طرح بنایا۔ اپنے ہاتھ کے سائے میں اُس نے مجھے چھپایا۔"

"اور اس نے مجھے ایک چمکتا ہوا تیر بنایا اور اپنی کمان میں اُس نے مجھے چھپایا۔"

"اور اُس نے مجھ سے کہا اے اسرائیل تو میرا خادم ہے جو میرا نام روشن کرے گا۔"

"اور[2] اس نے مجھ سے کہا یہ تو معمولی سی بات ہے کہ تو میرا خادم بن کے یعقوب کے قبیلوں کو اُبھارے گا، اور اسرائیل کے محفوظ لوگوں کو (ان کی عظمت) دوبارہ عطا کرے گا۔ میں تجھے کافروں کے لیے ایک روشنی بنا کے بھی بھیجوں گا کہ تو قیامت تک میری رحمت کا پیغام بر بنے۔"

"بادشاہ[3] تیرے پرورش کرنے والے باپ بنیں گے اور ان کی رانیاں تیری پرورش کرنے والی مائیں۔ وہ رُو بہ خاک ہو کر تیرے سامنے جُھکیں گے اور تیرے قدموں کی خاک چاٹیں گے۔ اور تو یہ جان لے گا کہ میں تیرا مالک (خدا) ہوں کیونکہ جو میرا انتظار کرتے ہیں وہ کبھی شرمندہ نہیں ہونے پاتے۔"

---

[1] عہد نامۂ قدیم "اِسایا" کتاب ۴۹ (۱ د ۲ و ۳) [2] ایضاً (۶) [3] ایضاً (۲۳)

یہودیوں سے قرونِ وسطیٰ میں جو تعصب کیا جاتا تھا اس کی وجہ زیادہ تر مذہبی تھی۔ قرونِ وسطیٰ کے عیسائی یہودی کو نہ صرف مذہب میں اپنے سے مختلف اور بے دین سمجھتے تھے بلکہ حضرت عیسیٰ کا قاتل بھی سمجھتے تھے لیکن اُس زمانے میں بھی اس تعصب کی ایک وجہ غالباً یہ ہوگی کہ چونکہ یہودی اپنے آپ کو نسلاً ممتاز سمجھتے تھے اس کی ضد میں یہودیوں سے ایک طرح کا نسلی تعصب پیدا ہوگیا تھا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی میں یہودیوں کو رنڈی خانوں میں جانے کی ممانعت تھی۔[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی مردوں کو بازاری عورتوں تک سے جنسی تعلقات رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ ملکہ جون[2] نے شہر اوی نیاں کے رنڈی خانوں کے متعلق جو احکام نافذ کیے تھے اُن میں سے دفعہ (۹) یہ تھی کہ

> "مہتمہ کسی یہودی کو رنڈی خانے میں آنے نہ دے گی۔ اور اگر کوئی یہودی کسی بہانے سے داخل ہوجائے اور کسی عورت کے ساتھ صحبت کرے تو اس کو قید کیا جائے اور شہر بھر میں پھرا پھرا کے اسے تازیانے مارے جائیں۔"

لیکن یہودیوں سے جدید یورپ اور بالخصوص جرمنی میں جس قسم کا بہیمانہ اور وحشیانہ تعصب ہے اُس کی بنیاد زیادہ تر نسل کے نظریے —— اور نسل کے غلط ترین نظریے —— پر ہے۔ اس کا

---

[1][2] *Dr. Norman Haire. Etc.* Encyclopaedia of Sexual Knowledge (Vol. I) (Aldor).

تفصیلی ذکر ہم اس وقت کریں گے، جب جدید یورپ کے "نسلی" نظریوں اور تعصبات کے بیان کا وقت آئے گا۔ یہاں اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ ممکن ہے کہ یورپ نے نسل پرستی کا سبق ایک حد تک یہودیوں سے سیکھا[1] اور پھر یہودیوں اور دنیا کی دوسری قوموں کو اپنے تعصب کا تختۂ مشق بنایا۔

---

[1] انگریزی میں ایک چھوٹی سی ظریفانہ نظم میں یہودیوں کے خاصان خدا ہونے کا مذاق اُڑایا گیا ہے۔

How Odd

Of God

To Choose

The Jews

تیسرا باب

جاذب شہنشاہیتیں

(۱)

ازمنۂ قدیم ہی سے ہم کو شہنشاہی کی دو قسمیں ملتی ہیں۔ ایک تو وہ جس میں حاکم قوم اپنے آپ کو محکوم قوم سے اعلیٰ اور ممتاز رکھنے کی کوشش کرے۔ یہ امتیاز "نسل" یا "مذہب" یا "زبان" یا کسی اور ایسی بنیاد پر مبنی ہوتا ہے۔ حاکم قوم اپنے افراد کو باور کراتی ہے کہ وہ محکوم قوم کے افراد سے نسلاً اعلیٰ ہیں، وہ منتخب ہیں اور خاصانِ خدا ہیں۔ اس وجہ سے اُن کو محکوم اقوام سے نہ ملنا چاہیے، اُن کے ساتھ شادی بیاہ نہ کرنا چاہیے اور اُن کو اپنے برابر نہ سمجھنا چاہیے۔ اس کا معاشی فایدہ یہ ہوتا ہے کہ محکوم قومیں حاکم قوم کی نظر میں خادم اور غلام بن جاتی ہیں۔ اس قسم کی شہنشاہی کو ہم علیحدگی پسند شہنشاہیت Isolative Imperialism. کہیں گے۔ اس کی اولین مثال ہندستان کی آریائی بولنے والی سلطنتوں میں ملتی ہے۔

دوسری قسم کی شہنشاہی وہ ہے کہ حاکم قوم رفتہ رفتہ محکوم اقوام کو اپنے ساتھ حکومت میں شریک کرلیتی ہے۔ اگرچہ ابتدا میں اس کو بھی حاکم و محکوم کے امتیاز کے دوَر سے گزرنا پڑتا ہے، لیکن یہ شہنشاہیت ایسی ہوتی ہے کہ اِس دوَر میں بھی وہ محکوم اقوام سے مساوات برتتی ہے۔ اِس شہنشاہیت کی بنیاد حاکم قوم کے تعصب اور علیحدگی پسندی پر نہیں بلکہ

محکوم اقوام کے اشتراکِ عمل اور تعاون پر ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ شہنشاہیت محکوم اقوام کو اپنے آپ میں جذب کرتی جاتی ہے۔ اگرچہ شروع میں حاکم قوم علیحدگی پسند شہنشاہیت کی طرح معاشی فایدہ نہیں اُٹھاتی، لیکن اس کا دیرینہ اثر یہ ہوتا ہے کہ قوموں کے اشتراکِ عمل کی وجہ سے اس قسم کی شہنشاہیت بہت دیرپا ہوتی ہے۔ مساوات کے سلوک کے باعث اور رواداری کی وجہ سے محکوم قوموں کو زیادہ شکایت نہیں ہوتی۔ اس قسم کی شہنشاہیت کو ہم جاذب شہنشاہیت Assimilative Imperialism. کہیں گے۔

یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اِن دو قسم کی شہنشاہیتوں کے درمیان کوئی قطعی خطِ فاصل نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ایک ہی شہنشاہیت بعض قسم کے عناصر کے لیے جاذب ہو اور دوسرے قسم کے عناصر کے لیے علیحدگی پسند، مثلاً اسلامی سلطنتوں میں سے اکثر ہر قوم، ہر نسل اور ہر طرح کے مسلمانوں کے لیے جاذب ہیں لیکن غیر مسلموں کے لیے علیحدگی پسند۔ اسی طرح برطانوی شہنشاہیت جو دنیا کی غیر سفید نسلوں کے لیے علیحدگی پسند شہنشاہیت رہی ہے۔ سفید نسلوں اور زیادہ تر برطانوی نسلوں (کناڈا، آسٹریلیا وغیرہ) کے لیے جاذب شہنشاہیت رہی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اگر ان دو قسموں میں دنیا کی شہنشاہیتوں کی تقسیم کی جائے تو عام رجحانات کا خیال رکھا جائے اور اسی بنیاد پر تقسیم کی جائے۔

(۲)

توریت اور دیگر صحایفِ آسمانی میں جس بخت نصر کا ذکر ہے وہ

تعاون پر تھا۔ میڈی سلطنت بابل کی سلطنت سے کہیں زیادہ وسیع اور کہیں زیادہ طاقتور تھی۔ اُس سے بھی بڑھ کے یہ کہ میڈی شہنشاہیت میں مختلف قسم کی جنگجو قومیں بستی تھیں۔

انھیں جنگجو قوموں میں سے جنوبی ایرانی (فارسی) قوم کے سردار کسریٰ Cyrus. نے میڈی شہنشاہ کو شکست دے کے ۵۵۰ء قبل مسیح میں ہخامنشی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ ۵۴۰ء میں اُس نے لیڈیا (مغربی ایشیائے کوچک) اور کئی یونانی جزیروں کو فتح کیا۔ ۵۳۹ء میں بابل کے پجاریوں کی دعوت پر اُس نے بابل کو فتح کیا اور بابل کی سلطنت کو فتح کر کے اپنی سلطنت کا ایک جزو بنالیا۔ فتحِ بابل کے بعد یہودیوں کو واپس فلسطین بھیجا۔ اُس کے بیٹے کیمبی سس Cambyses. نے شام، مصر اور شمالی سوڈان کو فتح کیا۔

خانہ جنگی کے ایک تھوڑے سے وقفے کے بعد ۵۱۶ء ق۔م میں یہ عظیم الشان سلطنت دارا کے قبضے میں آئی جس نے ہشتاسپ خاندان کی بنیاد ڈالی۔ دارائے اوّل کی سلطنت سے بڑی سلطنت دنیا نے اس وقت تک نہیں دیکھی تھی۔ دارائے اعظم کے کمزور جانشینوں کی سلطنت فتح کر کے سکندر نے جو سلطنت حاصل کی وہ بھی اس پُرانی ایرانی سلطنت کے مقابل ہیچ تھی۔ ڈینیوب کے دہانے سے لے کر دریائے سندھ تک اور ماوراالنہر سے سوڈان تک تمام ممالک اُس کے مطیع تھے یہ ماوراالنہر، مغربی پنجاب اور جنوب مشرقی بلقان کے ممالک اس کے باج گزار تھے۔

یہ سلطنت قایم اِس لیے رہ سکی کہ ذرایع حمل و نقل میں ترقی ہوگئی تھی۔ گھوڑے کو سواری کے لیے عام طور پر استعمال کیا جاتا تھا، سڑکیں تعمیر کی گئیں تھیں،

بابل کے عہدِ زریں کا شہنشاہ تھا۔ اس کا خاندان اصل میں اشوری تھا۔ تِل گھات پلے سوثالث نے بابل کو فتح کیا۔ سارگون ثانی نے اہلِ بابل کو (جو مفتوح تھے) خوش کرنا اور وہاں کے باشندوں کو اپنی سلطنت کا جزو بنانا چاہا اور اِس میں اُسے کامیابی ہوئی۔ بخت نصر کے زمانے میں بھی مفتوح اہلِ بابل جو کلدانیوں کے ساتھ سلطنت میں شریک تھے ہر طرح سے فاتح قوم کے برابر تھے اور ہر طرح اُنھوں نے بابل کے اِس دوسرے ترقی کے دور (پہلا عکادیوں کا تھا) میں خود بھی بہت کچھ کیا۔ اُنھوں نے مصر کے فرعون کو دریائے فرات کے کنارے ۶۰۵ قبل مسیح میں اپنے اقبالمند شہنشاہ بختِ نصر کی سرکردگی میں شکستِ فاش دی اور اُس کے بعد یہودیوں کو غداری کے جُرم میں اسیر کرکے بابل لے آئے۔

بخت نصر کے بعد میڈوں اور ایرانیوں کے ہاتھوں اس سلطنت کی تباہی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ بابل کے مقتدر (پجاری) عناصر نے اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ سلطنت کے تمام حصّوں کے دیوتاؤں کے مندر بابل میں بنائے جائیں۔ بخت نصر کے جانشین نابونی ڈس نے یہ مندر اس لیے بنوائے تھے کہ سلطنت کے دوسرے حصّوں کی قوموں اور بابل کے درمیان رشتۂ اتحاد مضبوط ہو۔ لیکن بابل کے خاص دیوتا "بل مردوک" کے پجاریوں کو یہ گوارا نہیں تھا اور اُنھوں نے شمالی زبردست سلطنت کے ایرانی شہنشاہ کسریٰ کو تسخیرِ بابل کی دعوت دی۔ بابل کے بادشاہ اور پجاریوں کا یہ جھگڑا دراصل علیحدگی پسند اور جاذب شہنشاہیت کا جھگڑا تھا۔

بابل کے شمال کی سلطنت یعنی میڈی ایرانی سلطنت بڑی زبردست تھی۔ بختِ نصر کی حکمتِ عملی کا مدار میڈیوں سے صلح، خوشگوار تعلقات اور

اور گھوڑے کی سواریاں دُور دُور تک سفر کرتی تھیں۔

لیکن محض ذرایع آمد و رفت اتنے پُرانے زمانے میں اتنی بڑی سلطنت کو برقرار رکھنے کے لیے کافی نہیں تھے۔ دارائے اعظم نے اپنے پیشرو کسریٰ کی طرح محسوس کیا کہ محکوم اقوام کے ساتھ رواداری اور عزّت کا سلوک کر کے اُن کو دوست بنانا چاہیے۔ اِس حکمتِ عملی کے تحت اُس نے غالباً دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اتنے بڑے پیمانے پر جاذب شہنشاہیت کے اُصول پر عمل کیا۔ محکوم اقوام کو سلطنت میں جذب کرنے کی اُس نے دو تدبیریں سوچیں۔ ایک تو یہ کہ ایرانی مذہب کی بلا جبر و اکراہ تبلیغ کی جائے۔ لیکن اُس سے بڑھ کر یہ کہ محکوم اقوام سے انتہائی رواداری کا سلوک کیا جائے۔ اُس کی سلطنت میں ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ بستے تھے۔ گورے اور زرد رنگ کے، سیاہ فام اور سانولے (آج بھی دنیا کے اُنھیں حصّوں میں اِن چاروں رنگ کے لوگ آباد ہیں) یہ لوگ مختلف زبانیں بولتے ہوں گے اور ہزارہا مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہوں گے۔ دارائے اوّل نے رواداری کو اپنا سب سے بڑا اصول بنایا اور اِس مختلف النوع آبادی کو اپنی سلطنت میں جاذب کر کے اُس کا جزو لانیفک بنانا چاہا تاکہ سلطنت کی بنیاد محض حاکم قوم کی تلوار کے زور پر نہ رہے بلکہ حاکم اور محکوم دونوں اقوام کے معاشی مفاد پر ہو اور وہ پائیدار ثابت ہو۔

کسریٰ اور دارائے اوّل نے جس طرح کی جاذب شہنشاہیت کی بنیاد ڈالی اُس سے دوسری سلطنوں نے بہت کچھ سیکھا۔ ہخامنشیوں

اور دارا کی اختلاطِ نسل اور جاذب طرزِ حکومت کی حکمتِ عملی پر سکندر نے عمل کیا۔ سکندر کے اُصول سے رومتہ الکبریٰ کی شہنشاہیت نے بہت کچھ سیکھا اور رومتہ الکبریٰ سے مسلمان سلطنتوں نے ایک طرف اور دوسری طرف مغربی بحیرۂ روم کے ممالک فرانس، اطالیہ اور اسپین نے دارائے اعظم کے اِس طرزِ سلطنت کا ایک دوسرا سلسلہ ساسانیوں سے ہوتا ہؤا مشرقِ وسطیٰ کی مسلمان سلطنتوں تک پہنچتا ہی۔

(۳)

سکندر، ارسطو کا شاگرد تھا۔ لیکن ارسطو کے اُستاد افلاطون کے فلسفے کو بھی وہ بالکل نہیں بھولا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہی کہ ایرانی طرزِ حکومت اُسے پسند آیا اور دارائے اعظم کی طرح اُس نے اپنی سلطنت کی بنیاد بھی حاکم اور محکوم اقوام کے اختلاط اور باہمی میل جول پر رکھی۔ ارسطو نے اُسے نصیحت کی تھی کہ ایشیا کی اقوام کمتر درجے کی ہیں اُن کو اپنے برابر نہ سمجھنا۔ سکندر نے اس نصیحت پر عمل کرنا تو ایک طرف اس کے برعکس ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا۔[۱] اُس نے ہر مفتوح قوم کو پوری مذہبی آزادی دی۔ خود ایک ایرانی شہزادی سے شادی کی اور اپنی فوج کے سرداروں کی شادیاں ایرانی اُمرا کی لڑکیوں سے کرائیں۔ جس طرح دارائے اوّل نے اپنی سلطنت کو کئی صوبوں (ساٹرپوں) میں تقسیم کیا تھا، اُسی بنیاد پر سکندر نے اُس سلطنت کی تقسیم کی جو اُس نے دارائے ثالث سے چھینی تھی۔ ایران کے بڑے بڑے اُمرا اور زمینداروں کی اُس نے قدر کی۔ باوجود اس کے کہ وہ پکّا یونانی تھا اور ہومر کی "ایلیڈ"

۱۔ H.A.L. FISHER: A HISTORY OF EUROPE

ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی تھی) لیکن اُس نے مشرقی ٹھاٹ باٹ سے
حکومت کرنی شروع کی۔ اِدھر مشرق کو یونانی علوم و فنون سے روشناس
کرایا، یونانی نمونے کے شہر بسائے، اُدھر محض اُس کی وجہ سے یونان مشرق
کے تمدّن سے آگاہ ہو سکا اور مشرق و مغرب میں ربط و ضبط کا سلسلہ
شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی قایم کی ہوئی حکومت (یعنی
یونانی اور مقدونی گھرانوں کی حکومت) ایشیا میں صدیوں تک باقی
رہی اور نپولین کی سلطنت اُس کی زندگی ہی میں ختم ہو گئی۔ ایرانی
شاعر اور مورّخین سکندر کو اپنا ہیرو مانتے ہیں۔ نظامی گنجوی نے سکندر نامہ
لکھا۔ بہت سے مورّخین نے عام روایات پر (جو غلطی پر مبنی تھیں) بھروسا
کرکے اُسے ایرانی النسل قرار دیا۔ جو سلطنت اُس نے باقی چھوڑی وہ
اگرچہ اس کے بعد ہی کئی حصّوں میں بٹ گئی مگر محض اس کی حکمتِ عملی
کی وجہ سے اِن حصّوں میں یونانیوں کا راج رہا، یونانی تمدّن پرورش
پاتا رہا اور یہی یونانی تمدّن اور علم پہلے اہلِ روما اور پھر عربوں کے لیے شمع ہدایت بنا۔
ایچ۔ اے۔ ایل۔ فشر[1] نے صحیح لکھا ہے کہ "اس کی سلطنت کی بنیاد
بنی نوعِ انسان کی مساوات کے نظریے پر تھی۔ اُس نے ایک ایسی
قوم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جو ایک عام معیار پر مبنی تھی اور ایک ایسے
بادشاہ کی مطیع تھی جسے خلقِ خدا اپنا اتنا بڑا محسن سمجھ کے خدائی کا سا
رُتبہ دینے کو تیار تھی۔"

یہاں ہم اس امر کا بھی ذکر کیے دیتے ہیں کہ یونان میں نسلی اختلاط

---

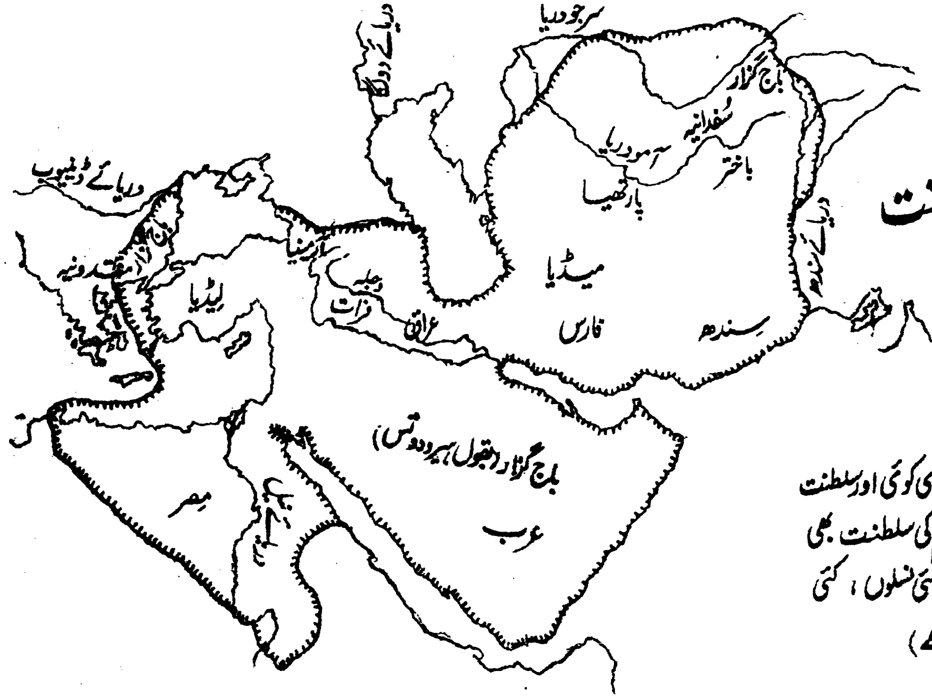
[1] H. A. L. Fisher- A History of Europe.

ہمیشہ ہوتا رہا۔ پروفیسر شنایڈر[1] نے یونانی نسلی اختلاط کے دو بڑے دوْر معیّن کیے ہیں۔ پہلا دوْر تقریباً سنہ ۱۳۰۰ ق.م سے شروع ہوا۔ اسی نسلی اختلاط کے دوْر میں جو صدیوں تک جاری رہا، جس میں مختلف نسلوں میں شادی بیاہ یا اغوا ('ایلیڈ' کا قصہ خود اس کی شہادت ہے) کا سلسلہ بڑے پیمانے پر جاری رہا۔ ہومر وغیرہ اسی دوْر کی یادگار ہیں۔ یہ نسلی اختلاط زیادہ تر ایشیائے کوچک میں ہوا ہوگا۔ یونان میں نسلی اختلاط کا دوسرا دور سنہ ۱۱۰۰ قبل مسیح سے شروع ہوا ہوگا۔ اِس دوْر میں نسلیں یونانی جزیروں اور جزیرہ نمائے یونان میں آپس میں مِلی جُلی ہوں گی۔

(۴)

کئی لحاظ سے رومۃ الکبریٰ یونان کا جانشین بنا۔ سکندر کی سلطنت اور رومۃ الکبریٰ کی سلطنت میں یہ فرق تھا کہ سکندر کی سلطنت بعض ایسے خطّوں پر تھی جن میں سے ایک کا تمدّن دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندستان اور مقدونیہ، باختر اور مصر کے تمدّنوں میں بڑا فرق ہوگا۔ لیکن رومۃ الکبریٰ کی حکومت بھی اگرچہ مختلف ملکوں پر تھی مگر وہ آپس میں ایک دوسرے سے اتنے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ بحیرۂ روم جس کے اطراف یہ سلطنت تھی رومۃ الکبریٰ سے پہلے بھی بحری تجارت کا مرکز تھا۔ فونیقی تاجروں کا دوْر گزرنے کے بعد قرطاجنہ کی تجارتی بندرگاہیں بحیرۂ روم بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اہلِ قرطاجنہ بحیرہ روم سے بھی باہر نکل کر اٹلانٹک کے یورپی اور افریقی ساحل میں دوْر

[1] Hermann Schneider: The History of World Civilization (Vol. II).



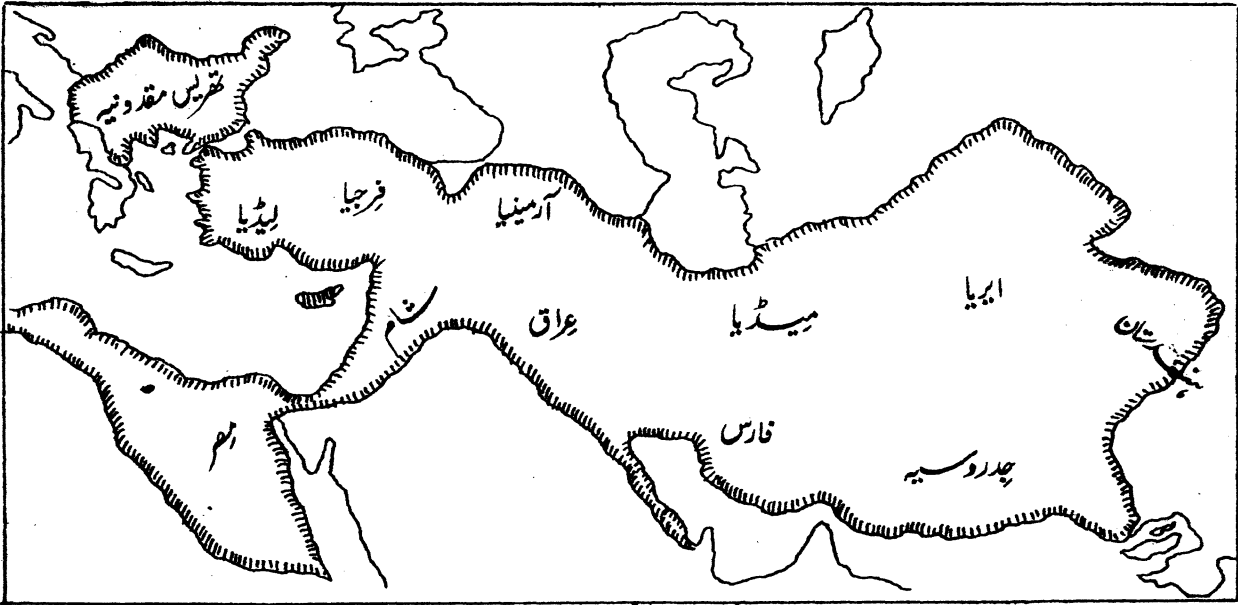
دارائے اعظم (اوّل) کی سلطنت

اور

باج گزار ریاستیں

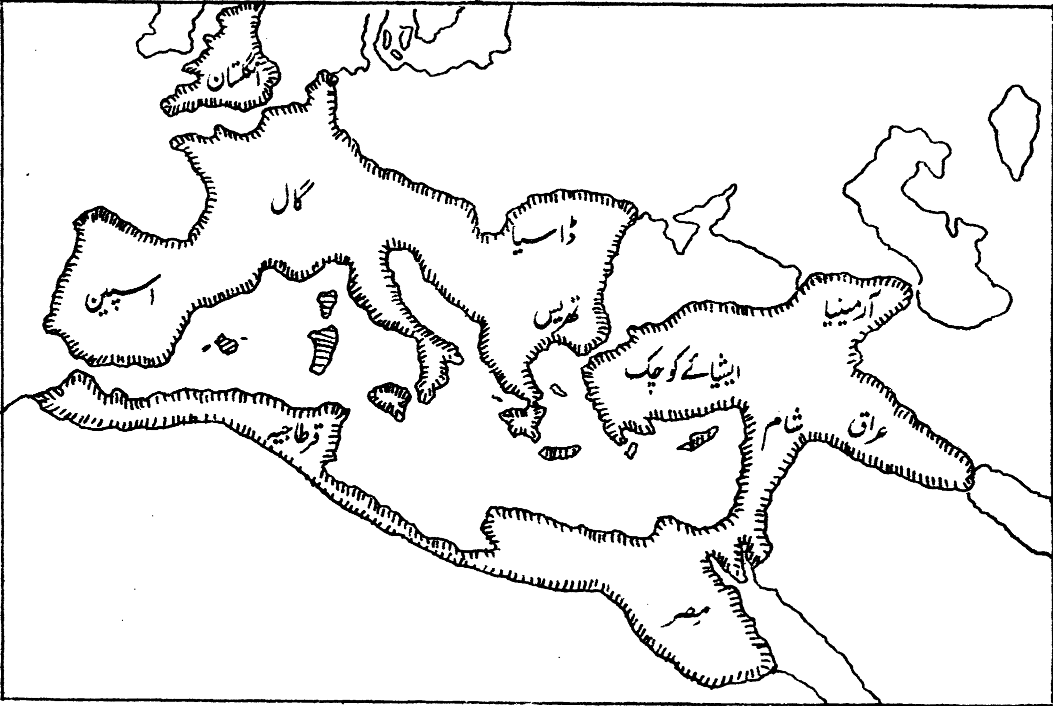
(تقریباً ۵۲۱ قبل مسیح)

(اُس وقت دنیا میں اس سے بڑی کوئی اور سلطنت نہیں ہوئی تھی اور اُس کے بعد سکندرِ اعظم کی سلطنت بھی رقبے میں اتنی بڑی نہیں تھی، کئی رنگ، کئی نسلوں، کئی قوموں کے لوگ اس سلطنت میں آباد تھے)



سکندر اعظم کی سلطنت

سنہ ۳۲۳ قبل مسیح۔ (سکندر نے دارائے ثالث کی سلطنت فتح کر کے یہ سلطنت اس کے نقوشِ قدم پر قائم کی)



رومۃ الکبریٰ کی سلطنت
کا انتہائی عروج
تیسری صدی عیسوی

دُور تک تجارت کرتے تھے ۔ یونانی بھی اپنے عروج کے دَور میں بحیرۂ روم کے کنارے دُور دُور تک پھیل گئے تھے ۔ الغرض بحیرۂ روم میں پہلے ہی سے تجارت اور اس کے سواحل پر بسنے والی قوم کے افراد میں آپس میں ربط وضبط کا سلسلہ کافی فروغ پاچکا تھا۔

روما کی سلطنت پہلے پہل قرطاجنہ کے نقوشِ قدم پر چلی، اُس کے بعد کچھ عرصے تک یونان کے نقشِ قدم پر۔ مسٹر ایچ۔ جی۔ ولیس کا یہ خیال سراسر غلط ہی کہ "رومتہ الکبریٰ میں پہلی مرتبہ 'آریائی' طرز پر حکومت کرنے کی کوشش کی گئی"۔ اِس قسم کی غیر ذمہ دارانہ تاریخ نگاری میکس مُلر کے ابتدائی غلط نظریوں کے اثرات کی گواہی دیتی ہی جن سے مسٹر ولیس جیسا بے تعصب مورخ بھی نہ بچ سکا۔ رومتہ الکبریٰ کی سلطنت میں اگر انگلستان اور وادیٔ رہاین کے بہت سفید رنگ باشندے تھے تو دوسری طرف شمالی افریقہ کے سواحل کے باشندے بھی شامل تھے، اُن کا رنگ آج گورا ہی لیکن یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس وقت بھی گورا ہوگا (اُس وقت تک رُومی، گاتھ اور عرب اقوام سے نسلی اختلاط نہیں ہوُا تھا، جو رومتہ الکبریٰ کی فتوحات کے بعد ہوُا) اس کے علاوہ شام اور ایشیائے کوچک میں گندمی رنگ کی "سامی" اقوام بستی ہوں گی ۔ ہنگری اور ٹرانسلوینیا کا وہ علاقہ جو اُس زمانے میں ڈاسیا کہلاتا تھا، ممکن ہی کہ زردی مایل رنگ کے لوگوں سے بھرا ہو۔

شروع شروع میں تو روما کی حکومت ضرور "علیحدگی پسند" شہنشاہیت

H. G. Wells: A Short History of the World. ﺍﻝ

کی حامی رہی۔ لیکن بہت جلد پہلے اطالیہ کے عام باشندوں اور پھر سلطنت کے دوسرے باشندوں کو حقوقِ شہری (یا حقوق مساوات) دے دیے گئے۔ اِس طرح رومتہ الکبریٰ کی جاذب شہنشاہیت نے یہ تمام مفتوحہ ممالک حقیقی معنوں میں اپنے صوبے بنا لیے۔ اِن صوبوں کے باشندوں کا تمدّن روما کا تھا۔ اِن صوبوں نے ایسے افراد پیدا کیے جو روما کے نامور ترین شعرا، فلسفی اور بسا اوقات شہنشاہ بنے۔

اکثر لوگوں کے ذہن میں روما کی قیصریت کی یہ تصویر ہے کہ سلطنت بھر میں روما کے دستے بھرے پڑے تھے، اور تلوار کے زور سے سلطنت بھر میں امن قایم رکھتے تھے۔ روما کی بحری تجارت کی کشتیاں اور فوجی کشتیاں کھینے کو غلاموں کے ہزاروں گروہ تھے جن کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ یہ تصویر جو شاید بعض جابر رومی شہنشاہوں کے زمانۂ حکومت کا مرقّع ہے مجموعی طور پر بالکل غلط ہے۔ رومی فوج کے پڑاؤ زیادہ تر سرحد کی چوکیوں پر ہوتے تھے اور اس کا امکان تھا کہ اس زمانے میں کوئی شخص مارسیلی سے لے کر بولون تک فرانس کے پورے طول کا سفر کرتا اور کسی رومی سپاہی کے خود کی جھلک تک نظر نہ آتی۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ روما کی اس عالیشان سلطنت کی بنیاد محض رضا و رغبت اور آپس کی خوش اعتقادی اور خوش مزاجی پر ہے۔[1]

گبن Gibbon. کی "تاریخ انحطاط و زوالِ روما" چونکہ ڈیڑھ صدی قبل لکھی گئی اس لیے بجائے اس کے کہ ہم رومتہ الکبریٰ

[1] H. A. L. Fisher : A History of Europe.

کی سلطنت کے آئین مساوات اور نسلی اختلاط کی وہ تصویر پیش کریں جو گبن نے کھینچی ہے، ہم انگلستان کے ایک جدید اور شہرہ آفاق مورخ مسٹر اتچ۔ اے۔ ایل۔ فشر کی تصویر کے کچھ حصے پیش کرتے ہیں:۔[۵]

"سلطنت کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک باہمی خوشگوار تعلقات کا ایک ایسا سلسلہ قایم تھا جس میں عہدِ حاضر کے تعصباتِ مذہب ونسل، قومیت وزبان ورنگ کی تلخی بالکل نہیں تھی۔ رومۃ الکبریٰ کی خدمت کرنے کو شامی اور ہسپانوی، افریقی اور برطانوی سب بلا کسی مشکل کے اکٹھا ہوتے، اور اُن میں سے کسی کو اس طرح ممتاز نہیں سمجھا جاتا تھا کہ دوسروں کو ناگوار ہو۔ سلطنت کے باشندے باعتبارِ نسل اہلِ روما سے اتنے قریب تھے اور اتنی آسانی سے اُنھوں نے روما کا تمدن سیکھ لیا تھا کہ وہ کسی طرح بھی کمتر درجے کے نہیں سمجھے جاتے تھے۔ شہروں کو حکومتِ خود اختیاری حاصل تھی اور وہ اپنے کاروبار کے مختار تھے۔ مذہب کی کوئی سختی یا ممانعت نہ تھی اور روما کے بڑے مندر Pantheon. میں ہر ملک کے دیوتا کے لیے جگہ موجود تھی۔ روما کا قانون اتنا ہمہ گیر اور جامع بنتا جاتا تھا کہ مختلف اقوام کے رسوم وآئین کی اجازت تھی۔ دیسی زبانیں مثلاً قرطاجنی Punic.، لیکونین Lycaonian. اور کیلٹی Celtic. بھی برابر رائج تھیں اور لاطینی کی حیثیت ایک عام زبان Lingua Franca. کی تھی۔"

یہ تصویر تو رومۃ الکبریٰ کے انتہائی تمدن وشوکت کے زمانے

---

[۵] *H. A. L. Fisher*: A History of Europe.

یعنی انتونائن بادشاہوں کے دَور کی تھی۔ لیکن نسلی اختلاط کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ہمیشہ اس سلطنت میں جاری رہا۔ جب روما کی آبادی میں انحطاط ہونے لگا تو شمالی جرمانی اور غیر جرمانی وحشی قبایل کو فوج میں بھرتی کیا گیا اور یہ سلسلہ سلطنتِ روما کے کامل انحطاط تک جاری رہا۔ یہ باہر کے سپاہی امن کے زمانے میں شہریوں کی طرح اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔

روما کی جاذب اور مخلوط شہنشاہیت کی تعریف فشر ہی کی زبانی سُنیے:۔

"اکثر[1] یہ ہوتا کہ فوج اور سلطنت کی بڑی بڑی خدمات ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتیں جن میں اطالوی خون کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ (شہنشاہ) مرقس آرے لی اس کے دو بڑے سپہ سالار شام کے باشندے تھے۔ تیسری صدی میں ایک شہنشاہ شامی تھا تو دوسرا عرب اور تیسرا افریقی جو قرطاجنی زبان بولتا تھا۔ یہ افریقی شہنشاہ سِپ ٹی مس سے وے رس تھا جس کو فوجی دستوں نے ۱۹۳ء میں تخت نشین کیا۔ ۲۱۱ء میں وہ بمقام یارک فوت ہوا۔ انگریزوں کو اُس کا نام یاد رکھنا چاہیے کیونکہ سالوے اور ٹاین کے درمیان اُسی نے دیوارِ ہیڈرین Hadrian's Wall کی مرمت کرا کے انگلستان کے لیے ایک صدی تک امن کا سامان مہیا کیا۔"

"تیسری[2] صدی عیسوی دو بڑے رومی مقننوں ال پین (Ul pian) اور پاپی نین Papinian. کی وجہ سے یادگار رہے گی۔ یہ دونوں

---

[1] و [2] H. A. L. Fisher : A History of Europe.

ایشیا کے رہنے والے تھے۔"

اِسی طرح تیسری صدی کا سب سے نامی فلسفی فلوطی نس یا افلاطون (ثانی) اگرچہ یونانی تمدّن اور علم کی پیداوار تھا لیکن اس کا وطن اسکندریہ (مصر) تھا۔

نہ صرف روم کی شہنشاہیت بلکہ روم کے تمدّن کا دار و مدار باہمی اختلاط اور ربط وضبط پر تھا۔ اسی لیے روما کے شہنشاہوں نے کچھ بعد دیگرے تقریباً تمام مفتوح ممالک کو مساوی حقوق عطا کیے۔ کلاڈیس Claudius. نے یہ حقوق گال (موجودہ فرانس) کو عطا کیے، ویس پاسی اِن Vespasian. نے اسپین کو ہیڈرین Hadrian. نے سپے نونیا کو یہاں تک کہ ۲۱۲ء میں کاراکالا Caracalla. نے پوری سلطنتِ روما کے تمام آزاد باشندوں کو برابر کے شہری حقوق عطا کیے۔ اور تمام رعایا کا ایک درجہ ہوگیا۔

غُلامی کا سلطنتِ روما میں رواج تھا۔ غلام قدیم تمدّن اور قرونِ وسطیٰ کے ایشیائی اور یورپی تمدّن کا جزو تھے۔ یونانی عمومیتوں اور مساوات پسند اسلامی سلطنتوں میں بھی غلام موجود تھے لیکن رومتہ الکبریٰ کی سلطنت میں غلاموں کا نظامِ سیاسی سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ اُن کو "شُدر" طبقہ بنایا گیا۔ ہر غلام اپنے آقا کی خانگی ملکیت تھا۔ اور غلام کسی نسل یا رنگ کا ہوسکتا تھا۔ کوئی خاص غلاموں کی قوم نہ تھی۔ ایک زمانے میں نوجوانوں اور لڑکیوں کی تعلیم تک غلاموں کے سپرد تھی۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ رومتہ الکبریٰ کی سلطنت میں غلاموں سے ہمیشہ بُرا سلوک نہیں کیا جاتا تھا اور بہت سے غلام پڑھے لکھے اور

عالم و فاضل ہوتے تھے۔ زیادہ تر جنگ کے قیدیوں کو غلام بنایا جاتا تھا مگر تہذیب و انسانیت اتنی ترقی کر چکی تھی کہ غلاموں کو انسان سمجھا جاتا تھا اور بہت سے غلام جلد ترقی کر کے آزاد متموّل شہریوں کا درجہ حاصل کر لیتے تھے[1]۔

بہر حال اِس عظیم الشان سلطنت کی بنیاد جاذب شہنشاہیت اور حاکم و محکوم قوموں کے باہمی ربط و ضبط اور تعاون پر تھی۔ یہ تعاون اتنا مکمل تھا کہ جلد حاکم و محکوم کا فرق مٹ گیا اور کاراکالا نے ۲۱۲ء میں سرکاری طور پر اس کا اعلان کیا اور سب کو مساوات کا درجہ دیا یہ سلطنت جو اپنی انتہائی وسعت کے زمانے میں خلیج فارس سے لے کر آبنائے آئرستان تک اور یوکرین اور آرمینیا سے لے کر مراکو تک پھیلی ہوئی تھی، یہ سلطنت جس کے بیچ میں بحیرۂ روم ایک جھیل بن کر رہ گیا تھا، باہمی اُخوّت، باہمی اتحاد اور باہمی اختلاط پر قایم تھی اور اسی وجہ سے یہ اتنے دنوں تک قایم رہی۔ اِس کے دو حصّے ہو گئے لیکن اس کی روایات دونوں میں باقی رہیں۔ یہاں تک کہ جرمانی وحشیوں نے مغرب کی سلطنتِ روما کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد انھیں وحشیوں نے مقدّس سلطنتِ روما کی بنیاد ڈالی جس میں قدیم رُومی اتحاد بین الملل کے ساتھ عیسائی اُخوّتِ انسانی کی روحِ عمل بھی شریک تھی۔ یہ ضرور ہوا کہ اس مقدّس سلطنتِ روما (جو بقول والٹیر نہ مقدّس تھی نہ سلطنت تھی اور نہ رُومی) کے شہنشاہ بہت جلد راہِ مستقیم اور

---

[1] Hermann Schneider: The History of World Civilization (Vol. II).

شارل مین کی حکمت عملی کے راستے سے بھٹک گئے۔ رومتہ الکبریٰ کی سلطنت کی مشرقی یعنی بازنطینی شاخ نے پہلے عربوں اور پھر ترکوں کو اتحاد اور اختلاط بین الملل کا سبق دیا۔

یورپ کے جنوب مغربی ممالک یعنی فرانس، اطالیہ، ہسپانیہ اور پرتگال، لاطینی ممالک کہلاتے ہیں باوجود اس کے کہ ان کی آج کل کی شہنشاہیت معاشی اور سرمایہ دارانہ ہے، آج بھی رومتہ الکبریٰ کے تمدن اور روایات اور اثرات کے بدولت ان کی شہنشاہیت جاذب ہے اور ان کے مقبوضات میں حاکم اور محکوم اقوام کے افراد کے درمیان زیادہ امتیاز نہیں صرف یورپ کے لاطینی ممالک ہی نے رومتہ الکبریٰ کی روایات کو برقرار نہیں رکھا بلکہ عربوں اور مسلمان سلطنتوں نے جاذب شہنشاہیت کے اصول سیکھنے میں اگر ایک طرف ساسانیوں کی شاگردی کی تو دوسری طرف رومتہ الکبریٰ کی۔

(۵)

ساتویں صدی عیسوی میں ایک نئی طاقت نمودار ہوئی جس نے یورپ اور ایشیا کو ہلا دیا اور سترھویں صدی عیسوی تک اس کا راج رہا۔ اسلام محض ایک مذہب نہیں تھا بلکہ سیاسیات، سلطنت، معاشیات اور معاشرت کا ایک نیا تصور بھی تھا۔

اسلام عرب میں پیدا ہوا اور ہمیں معلوم ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں کس قدر فرقہ بندی تھی ہر قبیلے کا بت جدا تھا۔ اسی طرح ہر قبیلے کی یہ ذہنیت تھی کہ وہ دوسروں سے ممتاز ہے۔ دوسرے قبیلے والوں سے شادی بیاہ حتی الامکان نہیں ہوتا تھا۔ خونریزیوں اور باہمی عناد کی

کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ کسی قبیلے کا کوئی منچلا نوجوان کسی اور قبیلے کی لڑکی کو اُڑا لے جاتا۔ اس پر آپس کی دشمنی اور خونریزی کا سلسلہ پشتوں جاری رہتا۔ جس گھرانے میں پیغمبر اسلام پیدا ہوئے وہ خود اپنے نسلی امتیاز پر خاص ناز کرتا تھا اور اپنا سلسلۂ نسب ابراہیم علیہ السلام سے ملاتا تھا۔ اِس لیے جب عرب طوفان کی طرح دُنیا میں پھیلے تو کون کہہ سکتا تھا کہ جس شہنشاہیت کی بنیاد وہ ڈالیں گے اُس کا اساسی نظامِ اُخوت اور رواداری، اختلاط اور ربط و ضبط پر ہوگا۔

لیکن مذہبِ اسلام کی تعلیم کا بڑا جزو اُخوت اور رواداری اور مروّت تھی۔ عیسائیت نے اس سے پہلے بنی نوعِ انسان کی عالمگیر مساوات اور اُخوت کی تعلیم دی تھی۔ یہ تعلیم آج تک اس لیے کامیاب نہیں ہوئی کہ یہ عالمگیر تھی۔ اسلام نے اِس احساس کے ساتھ کہ اگر پھر بلا کسی لحاظ کے عام طور سے تمام انسانوں کے لیے اُخوت سکھائی جائے گی تو کوئی اثر نہ ہوگا، پہلے یہ سکھایا کہ تمام بنی نوعِ انسان کے ساتھ مساوات کا سلوک کیا جائے۔ مساوات کے بعد اُس قلبی تعلّق کا سوال پیدا ہوتا ہے جس پر اُخوت کی بنیاد ہے۔ اُس کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ پہلے دوسرے کو مسلمان کرو پھر اُن سے بھائیوں کا سلوک کرو اور بھائی سمجھو۔ وہ کسی نسل کے ہوں، کسی رنگ کے ہوں، کوئی زبان بولتے ہوں لیکن اگر مسلمان ہیں تو تمھارے بھائی ہیں۔ یہ تعلیم اُس ملک میں دی جہاں نسل یا قوم تو ایک طرف ہر قبیلہ اپنی جگہ "علیحدگی پسندی" کی مثال تھا، جہاں کے لوگ اپنی زبان کے گھمنڈ میں غیر عرب لوگوں کو عجمی (گونگا) کہتے تھے۔ جہاں "عرب" اور "شریف" تقریباً ہم معنی تھے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسلامی جاذب شہنشاہیت پر دو بہت بڑے اثرات پڑے۔ پہلا اثر تو ایران کی ساسانی سلطنت کا تھا۔ عرب ایک طرح سے ساسانی حلقۂ اثر میں سمجھا جاتا تھا بہت سے اسلامی مورخین نے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ حضرت رسول مقبول صلعم، نوشیروانِ عادل کے زمانے میں پیدا ہوئے جغرافیائی لحاظ سے عرب کے شمال میں اور مشرق میں بھی خلیج فارس کے اُس پار ساسانی سلطنت تھی۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے زمانے میں عربوں نے اپنی فتوحات کے زمانے میں ایرانیوں سے بہت کچھ سیکھا، اور اپنے طرزِ حکومت کی بنیاد ساسانی اصول پر رکھی۔

دوسرا اثر بازنطینی (مشرقی رومی) سلطنت کا تھا۔ بازنطینی شہنشاہ رومتہ الکبریٰ کے مشرقی جانشین تھے۔ گاتھ اور جرمانی وحشیوں نے مغربی رومی سلطنت کو نیست و نابود کر دیا لیکن مشرقی رومی سلطنت باقی رہی اور اسی نے رومتہ الکبریٰ کی روایات کو زندہ رکھا۔ اِن روایات کے سوا شام اور فلسطین اور مصر میں یونان اور روما کا ادب اور علم بھی محفوظ تھا۔

اس طرح اسلامی جاذب شہنشاہیت کا سلسلہ ایک طرف تو ساسانیوں سے ہوتا ہوا دارائے اعظم کی جاذب شہنشاہیت کے تصوّر سے ملتا ہے۔ دوسری طرف بازنطینی سلطنت سے ہوتا ہوا رومتہ الکبریٰ کی جاذب شہنشاہیت سے، اور پھر سلسلہ بہ سلسلہ سکندرِ اعظم کی جاذب شہنشاہیت کے تصوّر سے جو خود دارائے اعظم کی سلطنت کے نقوشِ قدم پر قایم تھی۔ اسلام کی جاذب شہنشاہیت کی اس تاریخی نشو و نما کی

روحِ عمل اسلام کی تعلیم تھی جس میں مساوات اور اُخوت، اختلاط اور رواداری کی انتہا درجے تعلیم دی گئی تھی۔

اسلامی سلطنت کے پھیلنے سے پہلے پیغمبر اسلامؐ کے زمانے ہی میں اسلامی مساوات اور اُخوت کی روحِ عمل اچھی طرح سرایت کر چکی تھی۔ مثلاً صحابۂ نبوی میں حضرت بلالِ حبشی کی بھی وہی حیثیت تھی جو کسی عالی رتبہ، صحیح النسل قریشی کی تھی۔ علامہ شبلی مرحوم نے اس کی تصویر ایک نظم میں خوب کھینچی ہے:-

بارگاہِ نبویؐ کے جو موذن تھے بلال ۔۔۔ کر چکے تھے جو غلامی میں کئی سال بسر
جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینے میں کہیں ۔۔۔ جا کے انصار و مہاجر سے کہا یہ کھُل کر
"میں غلامِ حبشی اور حبشی زادہ بھی ہوں ۔۔۔ یہ بھی سُن لو کہ مرے پاس نہیں دولت و زر
اِن فضایل پہ مجھے خواہشِ تزویج بھی ہے ۔۔۔ ہے کوئی جس کو نہ ہو میری قرابت سے حذر"
گردنیں جھُک کے یہ کہتی تھیں کہ "دل سے منظور" ۔۔۔ جس طرف اُس حبشی زادے کی اُٹھتی تھی نظر
عہدِ فاروق میں جس دن کہ ہوئی اُن کی وفات ۔۔۔ یہ کہا حضرتِ فاروق نے با دیدۂ تر
اُٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا ۔۔۔ اُٹھ گیا آج نقیبِ حشمِ پیغمبر

حضرتِ عمر فاروق کی حکمت عملی کا دار و مدار اس اصول پر تھا کہ پہلے جزیرہ نمائے عرب کو مسلمان بنایا جائے۔ اسی بنا پر اُنھوں نے خیبر کے یہودیوں اور بجزان کے عیسائیوں کو ملک بدر کیا اور مسلمان عربوں کو ایک فوجی قوم بنایا۔ حضرتِ عمر کی خلافت کا رُجحان کسی قدر علیحدگی پسند شہنشاہیت کی جانب تھا[۱]۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ زمانہ اسلام کی ابتدا کا تھا اور اُن کو اس کا خوف تھا کہ ریگستانی عرب کہیں بہت جلد قیصر و کسریٰ کے

---

[۱] Philip Hitti : History of the Arabs.

تمدن کی عشرتوں میں ڈوب کر اپنے مذہب کو بھول نہ بیٹھیں۔ (خلفائے بنی امیہ اور عباسیہ کے زمانے میں وہی ہوا جس کا انھیں اندیشہ تھا) لیکن ساتھ ہی ساتھ عربوں کو اس کی بھی سخت ممانعت تھی کہ وہ عرب کے باہر کسی قسم کی زمین یا جایداد حاصل کریں[1]۔ مفتوحہ علاقوں کے باشندے اپنی زمینوں اور اپنی جایدادوں کے مالک رہے اور عرب فوجی سردار اور سپاہی خیموں میں زندگی بسر کرتے رہے[2]۔ مفتوحہ علاقوں کا نظم و نسق انھیں اصول پر ہوتا رہا جیسے قیاصرۂ بازنطین یا ساسانی بادشاہوں کی حکومت کے دور میں ہوتا تھا۔ ذمیّوں (یہودیوں اور نصرانیوں وغیرہ) کے ساتھ یہ رعایت تھی کہ اُن کے آپس کے تنازعات میں انھیں کے قوانین پر عمل کیا جاتا تھا اور اُن کی عدالتیں علحدہ تھیں۔ یہاں اس امر کا بھی تذکرہ کر دینا ضروری ہے کہ مذہب اسلام نے یہودی اور نصرانی اور دیگر اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کی جو اجازت دی تھی اس پر ابتدا ہی سے عمل شروع ہو گیا اور اس طرح نسلی اختلاط کا ایک سلسلہ جاری ہوا۔ حضرت عمر کے زمانے میں تمام مفتوحہ سرزمین تمام مسلمانوں کی مشترک ملکیت تھی اور صرف مالِ غنیمت اور جنگ کے قیدی فرداً فرداً ہر شخص کو بطور حصّے کے ملتے تھے۔ حضرتِ عثمان کے زمانے میں عربوں کو مفتوحہ علاقوں میں جایدادیں حاصل کرنے کی اجازت دی گئی۔

حضرتِ عمر کے زمانے میں اور اُس کے بعد بھی عرب غیر عرب مسلمانوں کو کچھ عرصے تک اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ اِس کے تین وجوہ تھے ایک تو یہ کہ یہ نو مسلم مذہب میں کچّے تھے، دوسرے یہ کہ عربوں میں اسلام

---

[1] و [2] ص Philip Hitti: History of the Arabs.

کی تعلیم سے پہلے نسلی امتیاز کا بڑا احساس تھا اور یہ کچھ دنوں باقی رہا۔ تیسرے یہ کہ یزید اور اُس کے اموی جانشین اپنی رنگ رلیوں کے لیے موالی (نومسلم) طبقے سے بھی خراج لیتے رہے لیکن بنی اُمیّہ ہی کے ایک نیک نہاد خلیفہ عمرِ ثانی نے عربوں اور نومسلموں کی اِس تفریق کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عربوں اور موالی میں کوئی ایسا امتیاز تھا جس کی بنیاد محض "نسل" پر ہو۔ کیونکہ عربوں اور موالی میں بہت شدّت سے شادی بیاہ کا سلسلہ شروع ہوگیا اور بہت جلد اس قدر نسلی اختلاط ہوا کہ نہ صرف مفتوحہ علاقوں میں بلکہ خود جزیرہ نمائے عرب میں بھی عرب اور موالی مل جُل کر ایک ہونے لگے۔

اسپین کی فتح کے کچھ دنوں بعد تک عربوں، موالی طبقے (جو زیادہ تر بربر تھے) اور ہسپانوی نومسلموں میں برائے نام امتیاز رہا[1] لیکن یہ بھی بہت جلد مٹ گیا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں کا رُجحان ہمیشہ نسل، اور تمدّن کے اختلاط کی طرف رہا۔ اور اسپین میں بھی عربی، بربر، افریقی، گاتھ، لاطینی نسلوں کے باشندے گھُل مِل کر ایک ہونے لگے۔

خلفائے بنی اُمیّہ میں عیش وعشرت عام ہوگئی تھی اور وہی پیش آیا جس کا حضرتِ عمر کو اندیشہ تھا یعنی عرب آرام طلب بن گئے۔ خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں لیکن اسی عیّاشی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں اور دوسری قوموں کی کنیزوں اور عورتوں میں جنسی ارتباط

---

[1] E. Levi- Provencal:—

L, Espagne Musalmane au xeme Siecle.

شروع ہوا اور دوسری قوموں میں اسلام پھیلنے لگا۔ یہ نومسلم بہت جوشیلے نکلے اور بہت جلد اسلامی فتوحات کا سہرا اِنھیں کے سر بندھا۔ بربروں نے اسپین اور شمالی مغربی افریقہ کو فتح کیا۔ ترکوں نے ماوراالنہر اور ہندستان کو، مغلوں نے جنوبی روس اور شمالی ایشیا کو، اور عثمانی ترکوں نے بلقان اور وادیٔ ڈینیوب کو فتح کیا۔

عہدِ بنی اُمیّہ میں موالی کو خالص عربوں سے کچھ کم سمجھا جاتا تھا۔ عرب قوم کی نسلی امتیاز کی روایات اسلامی تعلیم کی خلاف ورزی کر رہی تھیں۔ اوایل عہدِ بنی اُمیّہ کی اس غلطی کا نتیجہ اسلام کو اس طرح بھگتنا پڑا کہ اِن موالی نومسلموں نے فرقہ وارانہ تحریکوں میں حصّہ لینا شروع کیا۔ اس طرح شیعیت اور خارجیت کی تحریک ایران و عراق میں شروع ہوئی[1]۔ لیکن اس امتیاز کا ردِّ عمل بھی باہمی شادیوں کی صورت میں بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے عرب اور موالی کی تخصیص کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے سے پہلے بھی سلطنت کے دُور دراز صوبوں مثلاً ماوراالنہر، سُغدانیہ، مصر، افریقہ اور اسپین میں عربوں اور موالیوں کی تخصیص زیادہ نہیں تھی۔ اس کی خاص مثال ہمیں خُراسان میں ملتی ہے جہاں نومسلم تُرک عربوں کے دوش بدوش غیرمسلم ترکوں سے لڑتے تھے۔ عرب سردار بھی تُرک سرداروں کی طرح "دہقان" کہلاتے تھے اور اُن کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ بسا اوقات غیرمسلم تُرک (جو اہلِ کتاب

---

[1] Philip Hitti: History of the Arabs.

بھی نہیں تھے) مسلمانوں کے دوش بدوش لڑتے اور انہیں حقوق کے مستحق سمجھے جاتے تھے[1] ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بہت شدّت سے نومسلموں سے خراج لینے کی ممانعت کی جو بدعت اُن کے پیشرووں نے اپنے محاصل بڑھانے کے لیے رائج کی تھی ۔ اِس امتناعی حکم کی وجہ سے نومُسلم موالی معاشی حیثیت سے عربوں کے برابر ہو گئے اور چونکہ اُن کا تمدن عربوں سے زیادہ پُرانا تھا، وہ اُمورِ سلطنت پر بھی (عہد بنی عبّاس میں) حاوی ہو گئے۔

اسپین میں بھی یہی ہُوا ۔ طارق بن عمر کی فوج زیادہ تر نومسلم بربریوں کی تھی ۔ موسیٰ بن نصیر نے جب بہ نفسِ نفیس خود اسپین کا رُخ کیا تب کہیں پہلی بار عرب فوجیں اسپین پہنچیں ۔ یہاں بھی عربوں نے اسلامی تعلیم کے خلاف نسلی امتیاز جتانے کی کوششیں کیں جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بربریوں نے بغاوت کی ۔ اگرچہ کہ یہ بغاوت فرو کر دی گئی ۔ لیکن جس مقصد کے لیے یہ بغاوت کی گئی تھی وہ پورا ہو گیا اور اسپین میں تمام مسلمانوں کو مساوات کا درجہ حاصل ہو گیا ۔ اسپین میں مختلف نسل کے مسلمانوں کے الگ الگ نام تھے مگر ان میں شادی بیاہ اور ارتباط کا سلسلہ بہت گہرا تھا اور عربوں سے کہیں زیادہ طاقت بربری یا اسپین کے نومسلموں کو حاصل تھی ۔ باہر سے جو غیر عرب آئے تھے وہ موالی کہلاتے تھے (اُن میں بربر بھی شامل تھے) اسپین کے نومسلم "مُسالمہ" اور اُن کی اولاد "مولدون" کہلاتی تھی۔

---

[1] *Barthold*: Turkestan.

اسپین کے عیسائی "عجمی" تھے[1]۔ امارت بنو اُمیّہ کے زمانے میں "مولدون" سب سے زیادہ طاقتور تھے[2]۔ اِن میں سے بہت سے خانوانوں کے نام قبولِ اسلام کے بعد بھی ہسپانوی رہے مثلاً اشبیلیا کے بنوانجلینو اور بنوسباری کو۔ مختلف ادوار میں موالی اور ثقالبہ (یورپی غلاموں) کا بھی بہت زور رہا۔ اِس کے علاوہ اسپین کے مسلمان اور عیسائی شاہی گھرانوں اور رعایا کے گھرانوں میں شادی بیاہ کا سلسلہ ابتدا سے شروع ہوا اور جاری رہا۔ امیر عبداللہ کی شادی ڈانا انی گا اور المنصور کی سانکو ثانی شاہِ نوار کی لڑکی سے ہوئی۔ لاکھوں کی تعداد میں ہسپانوی کنیزیں تھیں اُن کے ذریعے جو نسلی اختلاط ہوا وہ اس کے علاوہ تھا۔

جو حکمتِ عملی حضرت عمر بن خطاب نے عرب کے لیے اختیار کی تھی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک ملکی پیمانے پر شروع کی یعنی اسلام کی تبلیغ اور غیر مسلموں پر پابندیاں۔ لیکن غیر مسلموں پر جو پابندیاں عاید کی گئیں وہ کچھ تو اسلامی رواداری کی بڑھتی ہوئی روایات کی وجہ سے اور کچھ سلطنت کے معاشی حالات کے اقتضا سے عمر بن عبدالعزیز کے انتقال کے بعد ہی اُٹھالی گئیں یا محض کاغذ پر باقی رہ گئیں۔

عہدِ بنی اُمیّہ میں ذمیّوں سے وہی سلوک کیا جاتا تھا جس کی مذہب نے ہدایت کی تھی۔ اُن سے ایک طرح کا جزیہ لیا جاتا تھا اور اس کے معاوضے میں انھیں فوجی خدمات سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ معاشی اور سیاسی لحاظ سے یہ شہنشاہیت کا ایک بہت کامیاب حربہ ہے۔ صدیوں

---

[1] و [2] E. Levi- Provencal:—

L, Espagne Musalmane au xeme Siecle.

بعد برطانوی شہنشاہیت نے ہندستان میں یہی طریقہ اختیار کیا) ذمّی عورتوں سے شادی بیاہ کی صرف اجازت ہی نہیں تھی بلکہ بہت کثرت سے اِن عورتوں سے شادیاں کی جاتی تھیں۔ عدالت اور قانون کے اعتبار سے ذمیّوں کو اُن کے مذہب کے لحاظ سے پورے پورے اور جُداگانہ اختیارات دیے گئے تھے۔

مذہب اسلام میں تو صرف یہودیوں، عیسائیوں اور سبائیوں کو اہل کتاب اور ذمّی قرار دیا گیا تھا۔ لیکن سیاسی اور معاشی نظام کا تقاضا یہ تھا کہ مجوس (ایرانی آتش پرستوں) اور بربری بُت پرستوں سے بھی ذمیّوں کا سا سلوک کیا جائے اور عہدِ بنی اُمیہ میں اِن کو بھی ذمّی قرار دیا گیا۔

معاشری لحاظ سے عیسائیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ معاویہؓ کی ایک بیوی عیسائی تھی، ان کے دربار کے ایک شاعر، ایک طبیب اور ایک معتمدِ مالیات کا مذہب عیسائی تھا۔

اسلام نے غلامی کی ممانعت نہیں کی تھی لیکن انسداد غلامی کی بہت سی بنیادی تجویزیں اس کی تعلیم میں شریک تھیں۔ مذہباً کوئی مسلمان کسی اور مسلمان کو غلام کے طور پر نہیں رکھ سکتا تھا، ہاں اگر کوئی غیر مسلم غلام مسلمان ہو جاتا تو آقا کو اختیار تھا کہ اُس غلام کو آزاد کرے یا نہ کرے۔ کسی کنیز کی اولاد اگر اس کے مالک کے سوا کسی اور کے نطفے سے ہو تو غلام سمجھی جاتی۔ لیکن اگر اُس کے مالک کے نطفے سے ہوتی تو آزاد ہوتی۔ کسی مرد غلام کے نطفے سے اگر کسی آزاد عورت کے اولاد ہوتی تو وہ بھی آزاد سمجھی جاتی۔ غلاموں کو آزاد کرنا بہت بڑے ثواب کا کام تھا۔ اگر کوئی غلام آزاد کیا جاتا تو اُس کا مالک اُس کا سرپرست بن جاتا۔

اور اگر سرپرست بے اولاد مرتا تو غلام اُس کی جایداد کا مالک بنتا۔

اگرچہ اسلام نے اس کی کوشش کی تھی کہ اس طرح غلامی کا انسداد ہو لیکن عرب فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیدی مرد اور عورتیں لاکھوں کی تعداد میں اسیر ہوتے اور غلام بنتے۔ رفتہ رفتہ بردہ فروشی تجارت کی بہت ہی فائدہ دینے والی شاخ بن گئی۔ بردہ فروشی زیادہ تر یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اگرچہ مسلمان بردہ فروشوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی پھر بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان ہمیشہ اپنے غلاموں سے بہت اچھا سلوک کرتے رہے۔ عباسیوں کی خلافت کے زمانے میں اُن غلاموں کا شمار جو خلیفہ کے پاس ہوتے درجۂ اوّل کے رؤسا میں تھا[۱]۔ خُراسان میں غلاموں کی جس طرح تربیت ہوتی تھی اس کا نقشہ نظام الملک نے بہت اچھا کھینچا ہی جس کے حوالے سے بارتھولڈ[۲] نے اس کو نقل کیا ہی کہ کس طرح ایک غلام پہلے سائیس کی خدمت انجام دیتا، پھر رفتہ رفتہ اس کو ترقی ملتی جاتی اور اس کے مرتبے میں اضافہ ہوتا جاتا یہاں تک کہ ساتویں سال وہ وثاق باشی بنتا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ خیل باشی اور حاجب کے مراتب تک ترقی کرتا۔ قابل ترین غلام حاجب بزرگ یا حاجب الحجّاب ہوتا جو پورے درباری نظام کا افسرِ اعلیٰ ہوتا۔ سامانیوں کے دوْر میں اور اُن کے بعد بڑے بڑے اہم صوبوں کی صوبہ داریاں اور سپہ سالاروں کے عہدے یا شاہزادوں کو دیے جاتے یا پھر تُرک غلاموں کو۔ چنانچہ خراسان، ماوراالنہر افغانستان اور شمالی ہندستان میں بہت سے غلام ایسے گزرے ہیں

---

[۱] *Hitti*: History of the Arabs.

[۲] *Barthold*: Turkestan.

جن کا نام تاریخ اسلام میں ہمیشہ زندہ رہے گا جیسے الپ تگین، تاش، فایق وغیرہ۔ اسلام کی جاذب شہنشاہیت اور انتہائے مساوات و اُخوت اور رواداری کا سب سے نمایاں نمونہ ہندستان کے "شاہانِ غلاماں" کی مثال ہی۔ ذرا یہ خاکہ[1] ملاحظہ کیجیے۔

(۱) قطب الدین ایبک
(شہاب الدین غوری کا غلام)

(۲) آرام شاہ — دُختر۔ منکوحۂ التمش (۳) (ایبک کا غلام)

(۴) رُکن الدین فیروز (۵) رضیہ (۶) معزالدین بہرام (۸) ناصرالدین محمود — دُختر منکوحۂ بلبن

(۷) علاء الدین مسعود — (۹) غیاث الدین بلبن (التمش کا غلام)

(۱۰) معزالدین کیقباد

دُنیا کے اور کسی حصّے یہاں تک کہ رومۃ الکبریٰ کی تاریخ بھی اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ غلاموں کے ساتھ یہ غیر معمولی سلوک سلطنتِ عباسیہ کے مشرقی صوبوں یا تُرکی نژاد گھرانوں تک محدود نہیں تھا۔ خود دارالخلافت بغداد میں غلاموں کا بڑا عروج تھا۔ اسپین میں نہ صرف محل شاہی کا انتظام بلکہ سلطنت کی مرکزی مہمات کا انصرام غلاموں کے ہاتھ میں تھا[2] اور یہ غلام زیادہ تر ہسپانوی نژاد ہوتے تھے)

---

[1] S. Lane Poole : The Mohammedan Dynasties.

[2] E. Levi,Provencal : L'Espagne Musalmane au Xeme Siecle

اِس طرح عہدِ بنی عبّاس میں وہ مساوات جس کی اسلام نے تعلیم کی تھی مسلمانوں میں اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ حاکم اور محکوم قومیں تو ایک طرف، حاکم آقا اور محکوم غلام کے تعلّقات باپ بیٹے کے سے ہو گئے تھے۔ کنیزیں جو پہلے خلفا اور بادشاہوں کے محلوں کی زینت بنیں، خلفا اور بادشاہوں کی مائیں بھی بنیں۔

عربوں اور محکوم قوموں کے اختلاط میں کنیزوں، غلاموں اور بردہ فروشی کے ساتھ ساتھ تعدّدِ ازدواج کا بھی بہت بڑا حصّہ رہا۔ خلافتِ عبّاسیہ دَور میں عربوں اور محکوم اقوام کا نسلی اور تمدنی ملاپ مکمل ہو گیا۔ خلفائے عباسیہ کے وزیروں (البرامکہ) کا خاندان ایرانی تھا۔ برمکی اپنا سلسلۂ نسب ساسانی عہد کے فرضی وزیر بزرگ مہر سے ملاتے تھے۔ صوبوں میں پہلے ایرانی اور پھر تُرک تمام امورِ سلطنت پر حاوی ہو گئے۔

عہدِ عبّاسیہ کے نسلی اختلاط کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ المنصور کی والدہ بربر تھی، مامون کی والدہ ایرانی تھی اور اسی طرح واثق اور مہدی کی مائیں ایرانی کنیزیں تھیں۔ المستنصر کی والدہ نیم یونانی نیم حبشی تھی۔ مُستعین کی والدہ سلاف نسل کی تھی۔ مکتفی اور مقتدر کی مائیں تُرک کنیزیں تھیں۔ ہارون الرشید کی ماں بھی بدیسی کنیز تھی[1]۔

عہدِ عبّاسیہ میں جب بغداد کی مرکزی حکومت کمزور ہونے لگی۔ تو پہلے ایرانی اور پھر تُرک صوبہ دار خود مختار ہونے لگے۔ ان کے درباروں میں بھی عرب، تُرک، ایرانی، مغل سب مِل جُل کر ایک قوم بنتے گئے۔

---

[1] Hitti: History of the Arabs

دورِ عباسیہ میں تجارت نسلی اختلاط کا ایک بڑا ذریعہ تھی۔ عرب تاجر سیلون، مالابار، جزایرِ شرق الہند سے ہوتے ہوئے چین تک پہنچتے تھے۔ انھیں نے جزایرِ شرق الہند اور ملایا میں اسلام پھیلایا اور جو عرب وہاں بس گئے وہ وہاں کی آبادی میں گھل مل گئے۔ تجارت کی ایک اور بہت بڑی شاہراہ بحیرۂ اخضر تھا، جہاں سے سغدانیہ اور ماوراالنہر کی پیداوار یورپ کو جاتی تھی، ایک اور بحری شاہراہ بحیرۂ اسود تھا۔ جہاں سے سویڈن کے تاجر وولگا اور ڈان وغیرہ کے ذریعے عربی سلطنت کی پیداوار اور صنعتی اشیا اپنے وطن کو لے جاتے تھے۔ چنانچہ بہت سے عربی سکّے اسکنڈی نیویا میں پائے گئے۔ انگلستان کے اینگلوسکسن بادشاہ اوفا کا ایک سونے کا سکّہ برٹش میوزیم میں موجود ہی یہ ۷۷۴ء کے عرب دینار کی نقل ہی، اس میں ایک طرف کلمۂ شہادت ہی اور دوسری طرف اوفا کا نام جس زمانے میں بحیرۂ روم کے مغربی حصّوں میں عرب فتوحات اور عرب قزّاقوں کی وجہ سے تجارت مشکل تھی، اسکنڈی نیویا سے تجارت کا سلسلہ اور زیادہ بڑھ گیا تھا[1]۔ مشرقی بحیرۂ روم میں اسکندریہ اور وینس کے درمیان تجارت زوروں پر تھی اور بردہ فروشی اس تجارت کا بہت اہم جزو تھی۔

اب ہم اگر صرف عہدِ بنی اُمیہ اور بنی عبّاس میں سلطنت کی وسعت کو پیشِ نظر رکھیں اور اس زمانے کے نسلی اختلاط کا اندازہ کریں تو اس کا اندازہ ہوسکتا ہی کہ اسلام "نسل" اور رنگ کے تصور سے اور جغرافیائی حدود سے کس قدر بے نیاز رہا۔ جن جن ملکوں پر اسلامی حکومت رہی اُن میں سے کوئی اپنے کو نسلاً خالص نہیں کہہ سکتا۔ اِن ملکوں میں

[1] Henri Pirenne: Mohammed et Charlemagne.

شمال مغربی چین ، چینی ترکستان ، ترکستان ، جنوبی سائبیریا ، جارجیا ، آرمینیا ، یوکرین ، وسطی اور جنوبی روس ، کریمیا ، ہنگری ، جنوب مشرقی پولینڈ ، بسربیا ، ہنگری ، جنوب مشرقی آسٹریا ، یوگو سلافیہ ، رومانیہ ، بلغاریہ ، البانیہ ، یونان ، کریٹ ، اٹلی کے بہت سے حصے ، سسلی ، جزایر بالیارک ، جنوبی اور مغربی فرانس ، اسپین ، پرتگال ، افریقہ کا صحرائے اعظم ، ریف ، نائیجیریا ، مراکو ، الجزایر ، تونس ، طرابلس ، مصر ، حبش ، شمالی لینڈ ، زنجبار ، مدغاسکر ، جزیرہ نمائے عرب ، فلسطین ، شام ، ایشیائے کوچک ، جزیرۂ قبرص ، تھریس ، کردستان ، عراق ، ایران ، ماورالنہر ، اسفدانیہ ، خراسان ، افغانستان ، ہندستان ، جزیرہ نمائے ملایا اور اکثر جزایر شرق الہند شامل ہیں ۔ ان سب ملکوں میں رنگ برنگ کے ، صدہا مختلف قسم کی زبانیں بولنے والے ، مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں لیکن سب آپس میں ملے جلے ، شادی بیاہ کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا اور اسلام نے "نسل" کے تصور پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ اسلامی ممالک میں یہ لفظ بے معنی سا ہوگیا ۔

عہدِ بنی عباس میں مساوات کا تصور اس قدر حاوی تھا کہ ذمیوں سے بھی برابری کا سلوک کیا جاتا تھا ۔ بڑے بڑے شہروں میں یہودی اور عیسائی مالیات اور حکومت کے بہت بڑے بڑے عہدوں پر فایز رہے اگر کبھی کبھی مسلموں اور ذمیوں کے مابین امتیاز کے قوانین منظور بھی کیے گئے تو اُن کی حیثیت "کاغذ پر روشنائی" کی سی رہی اور کبھی وہ اچھی طرح نافذ نہیں ہونے پائے[۵۱] ۔ خلفائے بنی اُمیّہ کی طرح خلفائے بنی عباس بھی اسلام اور مسیحیت کے مناظروں میں شریک ہوتے ۔ ساتویں صدی ہی میں

[۵۱] *Hitti* : History of the Arabs.

انجیل کے بہت سے حصّے شامی اور یونانی زبانوں سے عربی میں ترجمہ کیے جا چکے تھے۔ اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں کئی عیسائی وزارت کے عہدوں تک پہنچے[1]۔ جیسے عبدون ابن سعید۔ المتقی کا ایک وزیر مسیحی تھا۔ اور المعتضد کا میر عسکر ایک عیسائی تھا۔ خلفا کے اکثر و بیشتر اطبّا اور معالج عیسائی تھے۔

عیسائیوں کو عہدِ بنی عبّاس میں تبلیغ کی بھی اجازت تھی اور انھوں نے بہت سے مبلّغین کو ہندستان اور چین بھیجا[2]۔ (غالباً مسلمانوں میں مسیحیت کی تبلیغ کی ممانعت ہوگی) سیان فُو واقع چین میں اِن عیسائی مبلّغین کی یادگاریں اب بھی موجود ہیں۔ اِنھیں عیسائیوں نے وسطِ ایشیا میں عیسائیت کی تبلیغ کی ہوگی۔

یہودی جن پر بخت نصر سے لے کر ہٹلر کے زمانے تک ہمیشہ ظلم وستم ہوتا رہا۔ اسلامی سلطنتوں میں ہمیشہ خوش حال رہے اور اُن پر اُن کے مذہب یا اُن کی نسل کے جُدا ہونے کے جرم میں کبھی بے جا تشدّد نہیں کیا گیا۔ قرونِ وسطیٰ میں اسپین کے مسلمان یہودیوں سے جس رواداری سے پیش آتے تھے اگر اُس کا مقابلہ اُن مظالم سے کیا جائے جو انھیں لوگوں پر اس زمانے کی عیسائی ریاستوں میں ہوتا تھا۔ تو حیرت ہوتی ہے۔

اسلام کی تبلیغ میں جبر و تشدّد سے کبھی کام نہیں لیا گیا۔ مذہبی تبلیغ کے علاوہ سیاسی اور معاشی حالات نے خلافتِ بنی عبّاس کے زمانے میں اسلام کے پھیلنے میں بہت مدد دی۔ اسلام قبول کرتے ہی ہر غیر مُسلم اُس کامل مساوات اور مرتبے کا اہل قرار دیا جاتا جو بحیثیت مسلمان اس کا قدرتی حصّہ تھی۔ اسلام کی تبلیغ میں جبر و تشدّد کے فقدان کا اس سے

---

[1] و [2] *Hitti*: History of the Arabs.

اندازہ ہوتا ہے کہ شام میں عرصے تک عیسائی اکثریت رہی حالانکہ شام خلفائے بنی اُمیّہ کا دارالخلافہ تھا۔ عرب کی فتوحات سے تقریباً تین سو سال بعد کہیں ایران نے اپنا آبائی مذہب چھوڑا اور اب بھی فتح ایران کے تیرہ سو برس بعد ایران میں نو ہزار زرتشتی آباد ہیں۔ پارسیوں نے فتحِ ایران کے زمانے میں نہیں بلکہ اس کے بہت بعد آٹھویں صدی عیسوی میں ہجرت کی اور ہندستان آئے۔ ایران میں آتش پرستوں کو قانوناً ذمّی قرار دیا گیا تھا۔ انھیں ہر طرح کی مذہبی آزادی تھی اور نہ صرف ایران بلکہ عراق اور ہندستان میں بھی بہت سے آتشکدے اور زرتشتی معبد تھے[1]۔ پارسیوں کی ہجرت کی اصلی وجہ عربوں کا تشدّد نہیں بلکہ معاشی اور تجارتی اغراض تھے کیونکہ محمد بن قاسم کی فتوحات کے بعد ہندستان سے تجارتی روابط بہت بڑھ گئے تھے۔ اِنھیں پارسیوں نے ہندستان میں پھر شاہانِ گجرات اور شاہانِ مغلیہ کی اسلامی سلطنتوں کا زمانہ دیکھا اور کسی کے تعصب کا بھی شکار نہیں بننے پائے۔

ایرانی زرتشتیوں کے علاوہ ایران کے اور بہت سے مذہبی فرقے عہدِ عبّاسیہ میں برابر باقی رہے مثلاً مانی کے پیرو یا مزدکی مذہب کے پیرو۔ ہندستان کے اسلامی صوبوں میں ہندو مذہب باقی رہا اور محمد بن قاسم یا اس کے جانشینوں نے کبھی مذہب کے معاملے میں سختی نہیں کی۔

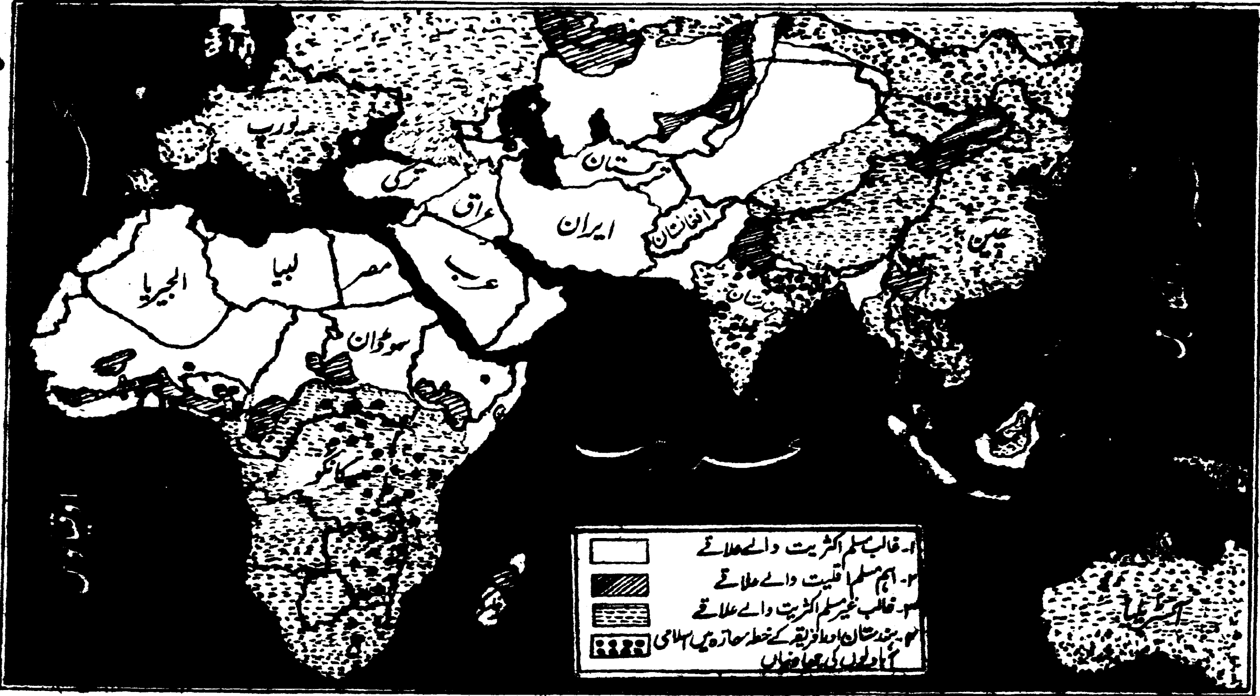
اگر مسلمان سلاطین اور بادشاہ واقعتاً مذہبی سختی کرتے تو آج اسپین جنوبی فرانس، بلقان، ہنگری، روس اور ہندستان کے تمام باشندے مسلمان ہوتے۔ نہ صرف عربوں بلکہ ترکوں اور تاتاریوں نے بھی کبھی مذہبی

[1] Hitti : History of the Arabs.

تشدّد نہیں کیا۔ آلِ عثمان کی سلطنت کے زیادہ تر صوبوں کے باشندے عیسائی تھے اور عیسائی ہی رہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ایک ایسے صوبے (بنگال) میں ہی جو کبھی کسی بڑی اسلامی حکومت کا مرکز نہیں رہا۔

ہندستان کی تاریخ میں اسلامی دوْر رواداری اور نسلی اختلاط کی ہر ہر قدم پر شہادت دیتا ہی۔ ہندستان میں جم کے سلطنت شروع کرتے ہی مسلمانوں نے ہندو تمدّن سے بہت کچھ اخذ کرنا شروع کیا۔ امتیازِ نسل و خون فاتح قوم میں بالکل نہیں تھا۔ اِسی وجہ سے بہت جلد مسلمان بادشاہوں نے ہندو رانیوں اور راجکماریوں سے شادی بیاہ کا سلسلہ شروع کیا۔ علاءُالدین خلجی کی شادی سیاسی اعتبار سے ہندستان میں جاذب شہنشاہیت کی طرف پہلا قدم تھی۔ یہ ارتباط بہت جلد اس قدر گہرا ہو گیا کہ جب حسن نے دکن میں سلطنت قایم کی تو اس کا نام بہمنی سلطنت پڑا اور اُس نے اپنے نام کے آگے اپنے ہندو سرپرست گنگو کا نام بڑھایا۔ بہمنی سلطنت کی کی رواداری کی روایات سلطنتِ آصفیہ میں آج تک موجود ہیں، جہاں سلطنت کا اعلیٰ ترین اعزازی عہدہ دار یعنی پیشکار ہندو ہوتا ہی۔

اکبر کے زمانے میں ہندستان میں جاذب شہنشاہیت، عروج کے انتہائی نقطے پر پہنچ گئی۔ اُس نے پہلی مرتبہ اہلِ ہندستان کو ایک قوم بنانے کی باقاعدہ کوشش کی۔ اس نے راجپوت شاہی گھرانوں میں شادی بیاہ کا سلسلہ ڈالا اور جہانگیر اور شاہجہاں اگر نصف مغل تھے تو نصف ہندو، اگر نصف چغتائی تھے تو نصف راجپوت۔ سیاسی اور معاشی اعتبار سے، اور اس باعث معاشری اعتبار سے مسلمان اور ہندو برابر تھے اور اُن میں


یورپ
ترکی
عراق
ایران
ترکستان
افغانستان
چین
عرب
مصر
لیبیا
الجیریا
سوڈان
ہندستان
اوقیانوس
آسٹریلیا
۱- غالب مسلم اکثریت والے علاقے
۲- اہم مسلم اقلیت والے علاقے
۳- غالب غیر مسلم اکثریت والے علاقے
۴- ہندستان اور افریقہ کے خط حارہ میں اسلامی آبادیوں کی جماعتیں

کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اسلام میں جاذب شہنشاہیت کا جو تصوّر مسلمانوں اور زیادہ سے زیادہ اہلِ کتاب تک مخصوص تھا۔ اکبر نے اس کو تمام غیر مسلموں پر منطبق کیا اور ایک نئے تمدّن کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی۔ اِس تمدّن نے اپنی دو نشانیاں چھوڑیں مغل طرزِ تعمیر اور اُردُو زبان۔

اکبر کی جاذب شہنشاہیت کی روایات جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں باقی رہیں۔ لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں ایسے اسباب کی بنا پر جو زیادہ تر نفسی اور معاشی تھے اس کا ردِّعمل شروع ہوا۔

مجموعی طور پر اسلام نے ہمیشہ ہر ایسے اختلاف کی مذمت کی جس کی بنیاد نسل، قوم، زبان یا وطن پر ہو۔ اسی اصول پر پان اسلامزم کی تحریک کی جمال الدین افغانی نے بنیاد ڈالی اور یہی اصول اقبال کے فلسفۂ سیاسیاتِ ملّی کا رُکنِ رکین ہے:۔

ربط و ضبطِ ملّتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اِس نکتے سے اب تک بے خبر
ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ وخوں مٹ جائے گا
تُرکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدّم ہو گئی
اُڑ گیا دُنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر

اسلام نے نسلی تعصبات پر جو کاری ضرب لگائی ہے اُس کا اکثر

مغربی مستشرقین[1] اور مورّخین نے اعتراف کیا ہے اور اُس کا مقابلہ یورپ کے تعصّبات سے کیا ہے۔

---

[1] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو C. S. Hargronje : "Islam and the race problem" (in the "Moslem World of Today" edited by J. R. Mott).

"Practically in the Moslem world neither birth nor Colour has prevented men from reaching the highest positions.............Islam offered a chance to all races and all of them have availed themselves of it in the measure of their talents."

یا زیادہ واضح الفاظ میں فرانسیسی مورّخ P. J. Andreas کی رائے اس کی کتاب .Islam et les Races میں ملاحظہ کیجیے:

"Marquee par l'hellenisme, Cette civilisation, d'Arabe devint bientot persane, egyptienne, berbere, andalouse ; la encore Se retrouve le Cachet propre des races sous le grand voile islamique. Cette civilisation a cependent ceci de characterstique, qu'elle S'oppose partout en son ensemble a la civilisation europeenne."

چوتھا باب

سُفید آدمی کا بوجھ

(۱)

سولھویں صدی میں یورپ کے باشندے دوسرے ملکوں کا سفر کرتے تو اُن ملک کے باشندوں کے متعلق اپنی رائے اس طرح تحریر کرتے گویا وہ اس مختصر سے سفر میں اُن ملکوں کی تمام خصوصیات سے واقف ہو گئے ہیں۔ سب سے زیادہ تعریف اپنے ہی مُلک، اپنے تمدن اور اپنے ہموطنوں کی ہوتی۔ وہ تمام خوبیاں جن کی مسافر کو تلاش ہوتی اپنے ہی ملک میں نظر آتیں اور جو قومیں یا ملک اُسے ناپسند تھے تمام عیوب اور خرابیاں اُن میں۔ سولھویں اور سترھویں صدی کے انگریزی ادب میں اس کی بہت مثالیں ملیں گی۔

اِدھر کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا اور اُدھر واسکو ڈی گاما ہندستان پہنچ چکا تھا۔ نئی اور پُرانی دنیا دونوں سے تجارت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور تجارت کے ساتھ فتوحات کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں ہسپانیہ اور پُرتگال سب سے پیش پیش تھے۔ اُس کے بعد ولندیزیوں نے اِسی میدان میں قدم رکھا۔ یہ "تجارتی نظریۂ زر Mercantilism. کا دَور تھا۔ یورپ کے بادشاہوں کی نظر اِس نئے ذریعۂ آمدنی پر تھی جس کی مدد سے وہ یورپ میں اپنی حشمت اور

اپنی برتری کو قایم رکھنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ۱۴۹۳ء سے لے کر ۱۶۴۰ء تک ہسپانیہ نے امریکہ سے (۸۷۵) ٹن سونا اور (۱۶۷۲۰۴) ٹن چاندی حاصل کی جس کا پانچواں یعنی بیس فی صد حصہ بادشاہ کو ملتا۔[1] تجارتی نظریۂ زر کی بنیاد اُن خاص سیاسی، معاشی اور مذہبی حالات پر تھی جو اُس زمانے میں یورپ کی خصوصیت تھے مگر اس کے بعد سے یہ حالات بدل گئے۔

"تجارتی نظریۂ زر" کی بنیاد پر نئی دنیا میں جو چار شہنشاہتیں تھیں وہ ۱۷۶۳ء سے لے کر ۱۸۲۵ء تک یا تو مٹ گئیں یا اُن کی شکل بدل گئی۔ ۱۷۶۳ء میں انگلستان نے فرانس کے امریکی مقبوضات پر قبضہ کرلیا۔ ۱۷۷۶ء میں امریکی نوآبادیات (جو بعد میں ریاستہائے متحدہ بن گئیں) کے اعلانِ آزادی سے خود برطانوی شہنشاہیت کو سخت صدمہ پہنچا۔ ۱۸۱۰ء سے لے کر ۱۸۲۵ء تک امریکہ میں اسپین کی شہنشاہیت کا خاتمہ ہوگیا اور ۱۸۲۲ء میں پُرتگال کے قبضے سے برازیل نکل گیا۔

کچھ اس وجہ سے اور کچھ یورپ کے صنعتی انقلاب کے باعث یورپ اور خصوصاً انگلستان کے ماہرینِ معاشیات نے "تجارتی نظریۂ زر" کے بجائے آزاد تجارت کی اہمیت پر زور دیا۔ انگلستان میں جیمز مِل، مالتھس وغیرہ سب آزاد تجارت کے حامی تھے اور دُور دراز حصّوں پر شہنشاہیت کے خلاف تھے چنانچہ کابڈن Cabden. نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمتِ عملی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا کہ" قدرت اپنے قوانین کی برتری کو قائم رکھے گی اور سُفید چمڑے والے لوگوں کو اپنے ملکوں کو واپس آجانا پڑے گا۔

---

[1] P. T. Moon: Imperialism and World Politics.

اور ہندو (ہندستانی) اُس آب و ہوا سے لُطف اندوز ہوتے رہیں گے جس کے لیے اُن کے چہروں کا رنگ بہت مناسب ہی"! ملکۂ وکٹوریا کے زمانے میں بھی آزاد تجارت کی حمایت کی ہوا بندھی ہوئی تھی، یہاں تک کہ ڈزرائے لی Disraeli. نے اِس ہوا کا رُخ بدلا۔ یہی حال ایک حدتک فرانس کا تھا اور جرمنی میں بسمارک تو نوآبادیاتی شہنشاہیت کے جھگڑوں میں بالکل نہیں اُلجھنا چاہتا تھا چنانچہ جب فرانس نے اپنی شکستِ فاش کے بعد بجائے الساس لورین کے کوچین چائنا جرمنی کے نذر کرنا چاہا تو بسمارک نے صاف انکار کر دیا (حالانکہ بہت عرصے بعد بسمارک نے بھی اپنی حکمتِ عملی بدلی)

لیکن پھر صنعتی انقلاب ہی نے ایسے معاشی حالات پیدا کر دیے کہ بہت جلد یورپ کی دول کو اپنی حکمتِ عملی بدل دینی پڑی۔ کارخانوں سے جو سامان تیار ہو کے نکلتا تھا وہ اتنا زیادہ تھا کہ اس کے لیے نئے بازاروں، نئی تجارت گاہوں کی ضرورت تھی۔ ساتھ ہی ساتھ خام اشیا کی طلب بھی بڑھتی گئی۔ اس لیے یورپ کی دول میں سے ہر ایک کو ایسی نوآبادیاں، ایسے محکوم ملکوں کی تلاش ہوئی جہاں کی تجارت بلا شرکت غیرے اُن کے ہاتھ میں ہو۔

ایک اور بہت بڑی چیز جس نے اِس سرمایہ دارانہ نوآبادتی شہنشاہیت کی طرف یورپ کی دول کو اور زیادہ مایل کیا یہ تھی کہ ذرایع آمدورفت نے عین اسی زمانے میں بہت بڑی ترقی کی اور ذرایع آمدورفت کے ساتھ ساتھ ذرایع رسدورساید بھی بہت بڑھ گئے۔ ریل، دُخانی جہاز، موٹر، تار برقی، ٹیلیفون اور اب حال حال میں ہوائی جہاز اور لاسلکی نے

دنیا کے دُور دراز حصّوں میں یورپ کی شہنشاہیتوں کو آسان سے آسان تر بنا دیا۔

خام اشیا اور استوائی خطّوں کی پیداوار کی بھی یورپ کے صنعتی نظام کو بڑی احتیاج تھی۔ اس وجہ سے بھی دنیا کے اِن حصّوں پر حکومت کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ یہ اشیا آسانی سے دستیاب ہوسکیں۔

ایک اور معاشی جزو جس نے شہنشاہیت کی حمایت کی "فاضل سرمایہ" کا سوال تھا صنعتی ترقی کے باعث بہت سا ایسا سرمایہ یورپ کے فارغ البال ملکوں میں موجود تھا جو اگر اپنے ہی ملکوں میں لگایا جاتا تو اِتنی زیادہ آمدنی کی توقع نہ تھی جتنی کہ نوآبادیوں میں اِس سرمائے کے لگائے جانے سے

اِن براہِ راست معاشی اسباب کے ساتھ ساتھ ایک اور بہت بڑا سبب بھی تھا جس کی بنیاد معاشیات ہی پر تھی (حالانکہ اس میں جذباتی عُنصر بھی شریک ہے) یہ "وطنیت" کا ایک نیا تخیّل تھا۔ یہ سیاسی اور معاشی وطنیت یا وطن پرستی آزاد تجارت کی مخالف تھی اور اس نے "تجارتی نظریۂ زر" کو ایک نئے روپ میں ازسرِ نو زندہ کر دیا۔

اِس نئے تخیّل[1] کی بنا پر وطنیت یا وطن پرستی کے یہ معنی ہوئے کہ وہ لوگ جو ایک ہی زبان بولتے ہیں یا ایک ہی "نسل" سے ہیں، جن کا تمدّن اور تاریخی روایات ایک ہیں، اُن سب کو ایک آزاد ریاست میں سب سے الگ رہنا چاہیے۔ اِس نئے تخیّل کی بنا پر شہنشاہیت کے معنی یہ قرار پائے کہ غیر یورپی دیسی نسلوں پر بالکل مختلف یورپی نسلیں حکومت کریں۔

"وطنیت" Patriotism. بحیثیتِ لفظ زیادہ مقبول نہیں ہُوا اور اُس کی جگہ "قومیت" یا "قوم پرستی" Nationalism. نے لے لی۔

---

[1] P. T. Moon: Imperialism and World Politics.

جو انھیں معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

اِس طرح یورپ نے اُنیسویں صدی میں پھر سے شہنشاہیت کے لیے ایک دوڑ میں حصہ لینا شروع ہُوا۔ برطانیہ جس کے پاس اٹھارھویں صدی کی پُرانی شہنشاہیت (دوسری برطانوی شہنشاہیت) کے بہت سے حصّے باقی تھے سب سے آگے بڑھ گیا۔ اِس مرتبہ اسپین نے رقابت کی کوشش نہیں کی۔ فرانس اور جرمنی دیر میں اِس دوڑ میں شریک ہوئے اور حالات نے فرانس کا کچھ زیادہ ساتھ نہیں دیا۔ پھر بھی آخر میں فرانس کو ایک بہت بڑی افریقی سلطنت مل گئی۔ اطالیہ بہت دیر کے بعد اس مقابلے میں شریک ہُوا اور جو کچھ بچا کھُچا تھا اس کو مِل گیا۔

شہنشاہیت کی اس دوڑ میں بعض یورپی ملکوں کو دوسروں کے مقابل زیادہ حصّہ ملا لیکن بہر حال تقریباً تمام دنیا یورپی یا یورپی نژاد ملکوں کی سلطنتوں یا حلقہ ہائے اثر میں تقسیم ہو گئی۔ لیکن یہ تقسیم جس کی وجہ سے "محروم" یورپی اقوام کو شکایت باقی رہی، آخری تقسیم نہیں کہی جا سکتی۔ لینن[1] نے بہت پہلے اس امر پر زور دیا تھا کہ یہ تقسیم قطعی نہیں اور اس کی وجہ سے برابر لڑائیاں ہوں گی۔ پہلی جنگِ عظیم اور اُس کے بعد دوسری جنگِ عظیم نے یہ پیشین گوئی سچ کر دکھائی۔

(۲)

یورپی شہنشاہیت کو معاشی سرمایہ دارانہ شہنشاہیت کہا جا سکتا ہے کیونکہ تاریخ میں پہلی بار اس شہنشاہیت کا دار و مدار خالص معاشی اصول پر ہے لیکن حکمران اقوام کی حکومتیں صاف صاف معاشی توجیہیں

---

[1] Lenin, Imperialism, the highest stage of Capitalism

نہیں پیش کرتیں کیونکہ اس طرح حکمران اور سرمایہ دار طبقے کے اصلی فایدے کا راز صاف ظاہر ہو جائے گا۔ اس لیے اپنے یہاں عوام النّاس میں اور خود محکوم قوموں میں پروپاگنڈے کے لیے بہت سی تاویلیں پیش کی جاتی ہیں جن کا ہم تفصیل سے مطالعہ کریں گے کیونکہ "نسل" کا تصوّر بھی انھیں تاویلوں میں سے ایک ہی۔

حکمران ملک کے اہم سرمایہ دار طبقے کے سوا اور بھی بہت سی جماعتیں مختلف وجوہ سے شہنشاہیت کی بڑی حامی ہوتی ہیں مثلاً فوجی یا بحری افسر۔ یہ افسر جو محکوم ممالک یا نوآبادیوں کے فاتح ہوتے ہیں، یا اپنی دھاک سے امن قایم رکھتے ہیں، دل وجان سے اس امر پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ "پست نسلوں" پر سفید رنگ آدمی کی حکومت کو بڑھانا چاہیے۔[۱]

سیّاسوں نوآبادیوں کے عہدہ داروں اور اُن کے خاندان والوں کی بھی یہی رائے ہوتی ہی۔ جو سیّاس اپنے ملک کی سلطنت میں کسی قدر رقبے کا اضافہ کرلیتا ہی اس کی عزّت اور قدردانی ہونی ضروری ہی۔ چونکہ اُن کا پیشہ ہی یہ ہی کہ جاہل اور غیر متمدّن اقوام پر حکومت کریں اس لیے اُن کو یقین کامل رہتا ہی کہ ان کے ملک کا مقدّس فرض ہی یہ ہی کہ "رنگ والی" نسلوں کے اور زیادہ لوگوں پر حکومت کرے۔[۲]

ایک اور گروہ جو شہنشاہیت کا حامی ہی مشنریوں یا مذہبی تبلیغ کرنے والوں کا ہی۔ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے یورپ کی کسی سلطنت کا سایہ ہمیشہ مفید رہتا ہی۔

یہ تو اُن جماعتوں کا ذکر تھا جن کو نوآبادیات کی شہنشاہیت سے

---

[۱] و [۲] P. T. Moon : Imperialism and World Politics.

براہِ راست فایدہ پہنچتا ہی۔ لیکن ہر قوم کی بہت بڑی اکثریت نہ سرمایہ دار ہوتی ہی نہ عہدہ دار اور نہ پادری اس اکثریت کو مقبوضات سے براہِ راست کوئی فایدہ نہیں پہنچتا۔[1] حکمراں ملک کی حکمراں جماعت کو اس کی فکر ہوتی ہی کہ کس طرح اپنے ہی ملک کی اس اکثریت کو (جو عوام النّاس پر مبنی ہوتی ہی) شہنشاہیت کا حامی اور شیدا بنایا جائے۔ عوام النّاس کو اس شہنشاہیت سے معاشی فایدہ تو محض برائے نام پہنچتا ہی۔ اس لیے محض اس کے زور پر اکثریت شہنشاہیت کی حامی نہیں بن سکتی۔ اکثریت کو حامی بنانے کے لیے طرح طرح کے خیالات، طرح طرح کے نظریوں کا پروپیگنڈا کیا جاتا ہی یہ پروپیگنڈا بڑی شدّت سے کیا جاتا ہی اور اس کے لیے ایسے ذرایع اختیار کیے جاتے ہیں کہ جوش میں آکر وقتِ ضرورت اکثریت اس شہنشاہیت کو بچانے یا فروغ دینے کے لیے اپنی جان دینے کو تیار ہو جائے۔

اِس قسم کے خیالات کا پروپاگنڈا کیا جاتا ہی جو انسانی طبایع کی گہرائیوں تک پہنچ کے لوگوں کے جذبات کو حرکت دیں اور انھیں جوش دلائیں۔ کبھی انھیں یہ جوش دلایا جاتا ہی کہ دنیا کی دوسری قومیں تمھیں نیچا دکھا کے تمھاری آزادی سلب کرنا چاہتی ہیں۔ کبھی انھیں شہنشاہیت کی وسعت کے ساتھ آرام اور فارغ البالی کی زندگی کے سبز باغ دکھائے جاتے ہیں، کبھی انھیں قومی عزّت کا احساس کرایا جاتا ہی، کبھی ان سے کہا جاتا ہی کہ سفید اقوام نسلاً دنیا کی تمام "رنگ والی" اقوام سے برتر ہیں اور اُن کا فرض ہی کہ اور سب پر حکومت کریں۔ کبھی انھیں انسانیت کے پیرائے میں سمجھایا جاتا ہی کہ ان کا فرض ہی کہ وہ دنیا کی غیر متمدن اور

---

[1] P. T. Moon: Imperialism and World Politics.

"پست تر اقوام کو اپنا تمدن سکھائیں"[1]

جب کسی اور مغربی قوم سے کسی شہنشاہیت کو خطرہ پیدا ہوتا ہے تو قومی عزت کا سوال لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قومی عزت کا لحاظ بہر حال ضروری ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے قومی عزت کو صدمہ نہ پہنچے۔ اگر کوئی ایسی قوم جس میں محکوم بننے کی صلاحیت ہے کسی یورپی قوم کی قومی عزت کو ذرا سی بھی ٹھیس لگائے تب تو اس کا استیصال اور اس کی سرکوبی فرض ہو جاتی ہے۔ بقول پروفیسر موُن[2] "اگر کوئی مسلمان کسی اطالوی لڑکی کو بھگا لے جائے تو اطالیہ کو اس کا حق حاصل ہو جاتا ہے کہ طرابلس پر قبضہ کرلے۔ اگر میکسکو والے امریکہ کے قومی جھنڈے کو سلام نہ کریں تو امریکی بحری دستے ویراکروز پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ بہر حال قومی عزت ہمیشہ برقرار رہنی چاہیے"۔

اگر کسی محکوم قوم کو فتح کرنے کے لیے دو شہنشاہی قوموں میں رقابت ہو تب بھی دونوں طرف قومی عزت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ مثلاً مراکو پر قبضہ کرنے کی جب فرانس نے کوشش کی تو جرمنی نے مخالفت کی۔ اب اگر فرانس جرمنی کی بات مان لیتا تو فرانس کی قومی عزت پر حرف آتا۔ اسی طرح جرمنی کا اپنے اعتراض کو واپس لے لینا قومی عزت کو ٹھیس لگنے کے برابر تھا۔ ایسی مثالیں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

شہنشاہی حکومتوں نے اپنے ملکوں میں جو پروپاگنڈا کیا ان کی بنیاد محض "قومی عزت" کے غلط سیاسی مفروضات پر ہی نہیں تھی بلکہ علوم وفنون کو زبردستی اور بالکل بیجا اور غلط طور پر اپنے مطلب کے لیے مفید ثابت

---

[1] و [2] P. T. Moon : Imperialism and World Politics.

ثابت کرنے کے لیے توڑا مروڑا گیا۔ ڈارون Darwin. کے نظریوں کو اُلٹے معنی پہنائے گئے۔ لسانیات کو زبردستی انسانیات سے بھڑایا گیا۔ مذہبی دلایل پیش کیے گئے جو ذرا سی بھی سچی جرح کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ مابعدالطبیعیاتی تشریحیں کی گئیں۔ اخلاقیات اور نفسیات کا غلط طور پر استعمال کیا گیا۔ تاریخ کو اس قدر غلط طریقے پر لکھا گیا کہ اس کا اثر اس فن کی وقعت اور صحت پر پڑا اور اب کہیں جا کر تاریخ نگاری آہستہ آہستہ اُن تعصّبات کا پردہ چاک کرنے میں کامیاب ہو رہی ہی جو اُنیسویں صدی میں ڈالا گیا تھا۔ معاشیات کی تقسیم شہنشاہیت کی بنیادوں پر دی گئی۔ علمِ حیاتیات کو توڑ مروڑ کے لال بجھکڑوں کی طرح "نسل" کے غلط نظریے قایم کیے گئے۔ قدیم ترین نسلی، مذہبی، تمدّنی تعصّبات کو از سرِ نو اُبھارا گیا اور انتہا ہو گئی کہ "علمِ نجوم" کو بھی شہنشاہیت کے پروپاگنڈا کے لیے استعمال کیا گیا۔

(۳)

قبل اس کے کہ ہم امتیازِ نسل کے اُن نظریوں کا باقاعدہ مطالعہ کریں جن کو یورپ کی سرمایہ دارانہ شہنشاہیت نے استعمال کیا۔ ایک ایسے نظریے کا مختصر ذکر ضروری ہی جس میں "نسل" اور "تمدّن" کو یکجا کر دیا گیا اور یورپی نسل اور یورپی تمدّن کو دنیا میں نہ صرف بہترین قرار دیا گیا بلکہ اس کا یہ فرض بتایا گیا کہ وہ دنیا کی غیر متمدّن اقوام یعنی ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو تہذیب سکھائے۔ فرانسیسی ادیب اور سیاس ژُول فیری نے صاف صاف کہا کہ "اعلیٰ نسلوں" (جن میں قدرتی طور پر فرانس بھی شامل ہی) کا فرض یہ ہی کہ وہ "پست تر" نسلوں کو تہذیب سکھائیں۔ فرانس کی شہنشاہیت افریقہ میں

ایک فرضِ تمدّن آموزی Mission Civilisatrice. رکھتی ہی۔
جرمنوں نے بھی اسی طرح جرمن تہذیب Kultur. کو افریقہ کے جنگلوں
اور اگر ممکن ہوسکتا تو یورپ کی دوسری سلطنتوں کے مقبوضات تک
پھیلانے پر زور دیا۔ اس قسم کے خیالات کی سب سے بہتر نمایندگی انگریز
شاعر کپلنگ نے کی اور "سفید آدمی کے بوجھ" کی اصطلاح اسی کی ایجاد ہی۔
اس کی نظم کا یہ حصّہ ملاحظہ ہو:۔

Take up the white man's burden—
Send forth the best ye breed—
Go bind your sons to exile—
To serve your captive s'need ;
To wait in heavy harness
On fluttered fold and wild—
Your new- caught, Sullen peopies
Half-devil and half child.

جہاں متمدّن سفید آدمی کو اپنے اِس فرض کا احساس تھا کہ وہ
غیر متمدّن ایشیائی اور افریقی دیسی باشندوں کو بقول کپلنگ "نیم طفل
اور نیم شیطان" ہیں، تربیت دے اور انھیں تمدّن سکھائے، وہاں اُسے
اس کا بھی یقین تھا کہ یہ غیر متمدّن لوگ طبعاً اور فطرتاً پست ہیں اور وہ کبھی
متمدّن نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ کپلنگ ہی نے یہ بھی لکھا:۔

For East is East and West is West.
And never the twins shall meet.

ساتھ ہی اس کا بھی یقین تھا کہ دنیا کے تمدّن کا سارا نظام، انسانیت اور آزادی کے تمام تر تخیلات سفید آدمی ہی کے دم سے وابستہ ہیں۔ اس خیال کا بھی بہت اچھا نمونہ کپلنگ ہی کے یہاں ملتا ہی۔

There's but one task for all,

One life for each to give,

What stands if freedom fall?

Who dies if England live?

اگرچہ یہ ثابت ہو چکا کہ غیر متمدّن دیسی اقوام سفید آدمی سے پست تر ہیں اور پست تر رہیں گی، کبھی اُن کا تمدّن اچھی طرح اختیار نہ کر سکیں گی اور سفید اقوام ہی تمدّن کی اصلی بانی اور اصلی نگہبان ہیں پھر بھی (معلوم نہیں کیوں؟) ان کا فرض یہ ہی کہ قربانی کر کے سفید آدمی کا بوجھ (یعنی "رنگ والی" غیر متمدّن اقوام کو فایدہ پہنچانے کی کوششوں کا بوجھ) برابر اُٹھاتی رہیں۔ اِن "نیم طفل، نیم وحشی" قوموں کی تربیت پھر بھی سفید آدمی کا فرض ہی اور کپلنگ کا ارشاد ہی:۔

"Take up the white man's burden

with patience to abide

To veil the threat of terror

And check the show of pride

By open speech and simple

An hundred times made plain

To seek another's profit

To work another's gain"

حیرت ہوتی ہی کہ سفید آدمی اس سخت بوجھ کو اٹھائے رہنے پر کیوں مُصر ہی۔ بقول مسٹر ای۔ایم۔فارسٹر E. M. Forster. اور زیادہ حیرت اس پر ہوتی ہی کہ جب کوئی اور سفید آدمی کسی سفید آدمی کا یہ بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہی (یا جنگ کر کے اس سے یہ بوجھ چھین لینا چاہتا ہی) تو وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ہی اور بسا اوقات انھیں وحشی غیر متمدن انسانوں کو اپنے مخالف سفید آدمی سے لڑنے کے لیے میدانِ جنگ میں لاتا ہی۔

(۴)

علیحدگی پسند شہنشاہیت کے مالک سفید آدمی سے آپ کا تعارف ہو چکا ہی۔ اب اس کی "نسل" کی کہانیاں سُنیے۔

"نسل" کے تمام نظریوں کی بنیاد اس مفروضے پر ہی کہ اہلِ یورپ طبقاً اور فطرتاً دنیا کی تمام نسلوں سے برتر ہیں اور انھیں اُن پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہی۔

"نسل" کے نظریے پانچ قسم کے ہیں۔

(۱) مذہبی نظریہ جس کی رُو سے تمام بنی نوعِ انسان کو حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں حام، سام اور یافث کی نسل سے قرار دیا گیا۔ اہلِ یورپ "یافث" کی اولاد ہیں۔ یہ مذہبی نظریہ امریکہ کی دریافت کے بعد ہی کمزور پڑ گیا۔ کیونکہ امریکہ کے باشندے اِن میں سے کسی گروہ میں شامل نہ کیے جا سکتے تھے۔ پھر جب چین اور جاپان اور جزایر شرق الہند کی "زرد" رنگ کی نسلوں کا علم ہُوا تو یہ نظریہ بالکل متروک ہو گیا۔

(۲) سفید رنگ نسل کا نظریہ۔ ہم رنگ کے اعتبار سے نسلوں کی تقسیم کا ذکر کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو دوسرا باب) اہلِ یورپ جن کا رنگ عام طور پر

سفید ہی۔ اپنے آپ کو اس نظریے کے اعتبار سے ایک علحدہ گروہ تصوّر کرتے ہیں۔ بعض بعض کو اس کا افسوس ہی کہ رنگ کے اعتبار سے اس گروہ میں شمالی افریقہ کے بربر، کچھ ترک، کچھ ایرانی اور یہودی بھی شامل ہو جاتے۔ یہودی لوگ بھی جب یہودی ہونے پر فخر نہیں کرتے تو اکثر "سفید" ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

(۳) آریائی نسل کا نظریہ۔ اس کا بھی ہم اس کتاب کے دوسرے باب میں ذکر کر چکے ہیں۔ اس کو بھی یورپ کے شہنشاہیت پسندوں نے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اِس میں بڑا نقص یہ تھا کہ بہت سی محکوم اقوام جیسے ہندستانی یا روس کے محکوم آرمینی اور جارجی بھی آریائی زبانیں بولتے ہیں اور انھوں نے بھی آریائی نسل سے ہونے کا دعویٰ کیا۔ اِس کا ایک علاج تو یہ کیا گیا کہ اِن ایشیائی آریائی زبانیں بولنے والوں کو مخلوط قرار دیا گیا اور دوسرا علاج یہ کیا گیا کہ آریائی نسل کو "نارڈک" نسل سے منسوب کیا گیا۔ آج جرمنی میں یہ دونوں نظریے بہت مقبول ہیں اور سرکاری طور پر ان کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہی۔ آریائی نسل کے نظریے میں ایک خرابی یہ ہی کہ یورپ کی بہت سی قومیں آریائی زبانیں نہیں بولتیں جیسے فِن یا استھونی یا اہلِ ہنگری یا باسک، عجیب بات یہ ہی کہ اِن میں سے اکثر ممالک اطالیہ اور جرمنی کی دوست ہیں۔ ایسی قومیں جو غیر آریائی زبانیں بولتی ہیں اپنے آپ کو "یوروپین" یا "سفید" کہتی ہیں اور وہ برتری کے انھیں دو معیاروں کی قایل ہیں۔

(۴) "یوروپین" ہونے کا نظریہ۔ یہ نظریہ نہیں بلکہ جغرافیائی حدود پر اس کا دارومدار ہی۔ اِس لحاظ سے یورپ کی "نسل" کے لوگ دوسری نسلوں سے ممتاز قرار دیے جاتے ہیں۔ قانون کے لیے یہ نظریہ سہل ترین ہی چنانچہ

انگلستان کی سول سروس میں ایسے برطانوی باشندے شریک ہو سکتے ہیں جو" یوروپین نسل" کے ہوں۔ اسی طرح امریکہ میں " غیر یوروپین" باشندوں کی ہجرت کی ممانعت ہی۔ انگلستان کی آزاد خیال .Liberal جماعت نے بجائے "سفید" یا "آریائی" یا "نارڈک" کی تخصیص کے ہمیشہ "یوروپین" گروہ ہی کی تایید کی۔ اسی اصول کو مدِنظر رکھ کے لائیڈ جارج نے گزشتہ جنگ کے بعد اس کی کوشش کی کہ ٹرکی کا وجود یورپ میں باقی نہ رہے[۱]۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہی کہ اتچ۔ اے۔ ایل۔ فشر جیسے آزاد خیال اور قابل مورخ نے اپنی تاریخِ یورپ کے دیباچے[۲] میں اس کا اقبال کیا ہی مشرق اور مغرب کے تمدّنوں کی باہمی آمیزش اور باہمی اثرات کے متعلق جو کچھ تحقیق ہوئی ہی اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ صاف صاف لکھتے ہیں: "اس کے باوجود یہ امر واضح رہتا ہی کہ ایک یوروپین تمدّن بھی ہی۔ ہم یوروپین آدمی کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں۔ ہم آسانی سے اُس میں اور بیکن یا بنارس یا طہران کے باشندے میں تمیز کر سکتے ہیں۔" مسٹر فشر کے اس خیال کی غلطی کا اندازہ اُن ہندستانیوں کو اچھی طرح ہو گا جنھیں اکثر اطالوی یا یونانی یا ہسپانی سمجھا گیا۔ اور اسی طرح بہت سے پرتگالی، ایشیا یا افریقہ کے باشندے سمجھے جاتے ہیں۔ نسلی اختلاط کے باعث محض جغرافیائی حدود کی بنا پر کوئی خطِ فاصل نہیں کھینچا جا سکتا اور مجھے کامل یقین ہی کہ مسٹر فشر نے لندن اور آکسفورڈ میں بہت سے مصریوں، شامیوں، عربوں اور الجزایر اور تونس کے بربر باشندوں کو یوروپین سمجھا ہو گا۔

(۵) نارڈک نسل کا نظریہ۔ اس نظریے کی بنیاد یہ ہی کہ یورپ کی سفید نسل

---

[۱] و [۲] *H. A. L. Fisher* : **History of Europe.**

اصل میں نارڈک یعنی سفید رنگ، سُنہرے بالوں والی، دراز قد نسل تھی جس کا وطن اسکنڈی نیویا یا شاید جنوبی رُوس تھا۔ یہی "نسل" میڈی ٹرے نین نسل اور یوریشیائی نسلوں سے ملی اور اُن کے رنگ کو اس نے سفید کردیا۔ یہ نسل جس کے "خالص" نمونے شمالی یورپ اور خصوصاً اسکنڈی نیویا، جرمن اور انگلستان میں نظر آتے ہیں بنی نوعِ انسان کی عظیم ترین نسل ہے۔ نارڈک نسل کا نظریہ ہی آج کل جرمنی میں سرکاری طور پر رائج ہے اور اسی نظریے پر جرمنی اور امریکہ کے نسلی اختلاط کے نظریوں کا مدار ہے۔ نارڈک نسل کے نظریے کے تجربے اور اس کی مبالغہ آمیز ستایش کی تغلیط سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم یورپ کی نسلی خصوصیات پر ایک نظر ڈالیں۔

(۵)

ڈارون Darwin. کی کتاب Origin of Species. ۱۸۵۹ء میں شایع ہوئی اور اُس کے قانونِ ارتقا کو بہت جلد انسانی نسلوں کے ارتقا پر جا و بیجا طریقے پر منطبق کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔

لیکن اِس کتاب کی اشاعت سے تین سال پہلے ۱۸۵۶ء میں پروشیا کے ایک موضع Neanderthal. میں ایک ایسے آدمی کی ہڈیاں دستیاب ہوئیں جس کے سر کی ساخت موجودہ بنی نوعِ انسان کے سر کی ساخت سے بہت مختلف تھی۔ ٹی۔ ایچ۔ ہکسلے نے تحقیق کرکے ثابت کیا کہ اِس ڈھانچے کا تعلق موجودہ بنی نوعِ انسان سے ضرور ہے اگرچہ کہ وہ بوزینہ سے بھی بہت قریب تھی۔ اس کے بعد ایک قسم کے بکثرت ڈھانچے جرمن، فرانس، جزایر رودبارِ انگلستان، جبرالٹر، مالٹا، اٹلی، یوگوسلاجنا اور فلسطین میں میں دستیاب ہوگئے۔ جس بنی نوعِ انسانی کے یہ ڈھانچے تھے اب

اس کو Homo Neanderthalnesis. کہا جاتا ہے۔ اِس نوع کے انسان ایک طرح کے پتھر کے اوزار استعمال کرتے تھے اور ایک زمانے تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ موجودہ بنی نوعِ انسان اسی نسل سے ہے۔ لیکن اب سائنس داں قایل ہو گئے ہیں کہ موجودہ بنی نوعِ انسان اِس نوعِ انسانی کی اولاد نہیں۔

ہائیڈبرگ کے آدمی کے علاوہ اور بھی کئی طرح کے ڈھانچے دنیا کے مختلف حصّوں میں ملے ہیں جو نوعِ بشر کے ابتدائی نمونے تھے لیکن جدید بنی نوعِ انسان کے ارتقا پزیر ہونے سے بہت پہلے ہی اِن تمام انواع کے انسان فنا ہو چکے تھے۔ اِن انسانی انواع میں سے Pithecanthropus. کا ڈھانچا جاوا میں اور Sinanthropus. کا ڈھانچا چین میں ملا اس طرح بنی نوعِ انسان سے قبل یہ دو انسان نما شاخیں غیر یورپی تھیں۔

یہاں[1] اِس امر کی صراحت ضروری ہے کہ علم الانسان اور انسانیات کی زیادہ تر تحقیق محض مغربی یورپ میں ہوئی ہے۔ اگر دنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی ڈھانچوں کو اسی طرح تلاش کیا جائے تو ممکن ہے کہ تمام موجودہ نظریے غلط ثابت ہوں۔

بہرحال یہ کہہ دینا کافی ہے کہ موجودہ بنی نوعِ انسان Homo Sapiens. یعنی انسانِ عاقل کے ارتقا پانے سے بہت پہلے ہی یہ تمام نسلیں نیست و نابود ہو چکی تھیں[2]۔ جس طرح ان نسلوں کے ہم عصر دیو پیکر جانور دنیا کی بدلتی ہوئی حالت کی تاب نہ لا سکے اور برف کے طویل عہد میں فنا ہو گئے اِسی طرح یہ ابتدائی انسان نما نسلیں بھی فنا ہو گئیں۔

---

[1] و [2] Julian Huxley and A. C. Haddon : We Europeans.

انسانِ عاقل Homo Sapiens. یعنی موجودہ انسان کو ارتقا پزیر ہوئے اور ظہور میں آئے بہت زیادہ عرصہ نہیں ہؤا۔

زمانۂ ما قبل تاریخ میں اب سے ہزار ہا بلکہ شاید کئی لاکھ سال پہلے ہماری زمین کئی برفانی دؤروں سے گزری عام طور پر چار برفانی دؤر گنے جاتے ہیں۔ اِن میں سے دوسرے برفانی دؤر کے ختم پر جاوا کی انسانی نوع Pithecanthro Pus. زندہ ہوگی۔ تیسرے برفانی دؤر کے شروع ہونے سے پہلے چین کی انسانی نوع موجود ہوگی اور یورپ میں شاید اُس نوع کے انسان بستے ہوں گے جس کا ایک ڈھانچہ ہائیڈبرگ میں ملا تھا۔ یہ انواع پتھر کا تھوڑا بہت استعمال جانتی ہوں گی۔ اس کے بعد تیسرے برفانی دؤر میں یورپ میں تو شاید ہی آبادی ہو۔ لیکن تیسرے اور چوتھے برفانی دؤر کے درمیانی وقفے میں نیانڈرتھال کی نوع یورپ میں آباد تھی اور اپنی پیشرو انواع کے مقابل پتھر کے اچھے اوزار بناتی تھی۔ نیانڈرتھال کی نوع پُرانی انواع کے مقابل موجودہ انسانِ عاقل Homo Sapiens. سے بہت قریب تھی۔ لیکن یہ نوع بھی فنا ہوگئی اور چوتھے برفانی دؤر میں موجودہ انسان ارتقا پزیر ہؤا۔[1] اس زمانے میں تمام یورپ سینکڑوں فٹ اونچی برف میں چھپا ہؤا ہوگا اور آبادی کے قابل نہ ہوگا۔ اِس لیے موجودہ انسانِ عاقل Homo Sapiens. یورپ میں تو بہرحال ارتقا پزیر نہیں ہؤا۔[2] امریکہ سے اس کا آنا قرینِ قیاس نہیں، برخلاف اس کے یہ اب تقریباً ثابت ہو چکا ہے کہ وہ پُرانی دنیا ہی سے امریکہ گیا۔ موجودہ انسان کے

---

[1] و [2] Julian Huxley and A. C. Haddon: We Europeans.

دو ہی اصلی وطن ہو سکتے ہیں۔ وسطِ ایشیا یا افریقہ۔ یہ کہنا بہت مشکل ہی کہ ان دو مقاموں میں سے کس میں اس نے پہلے جنم لیا۔ جب چوتھے برفانی دؤر کی شدت کم ہوئی تو موجودہ انسان یورپ پہنچا۔

چوتھے برفانی دؤر کے خاتمے پر موجودہ انسان نہ صرف وجود میں آچکا تھا بلکہ اس کی کئی قسمیں (جو اصل میں غالباً ایک ہی جڑ سے نکلی تھیں) یورپ، ایشیا اور افریقہ میں پھیل بھی چکی تھیں۔ دوسری انسانی انواع کے فنا ہو جانے اور موجودہ انسانِ عاقل کے باقی رہنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ موجودہ انسان میں دنیا کے مختلف حصّوں کی جغرافیائی آب وہوا کے برداشت کرنے کی بڑی صلاحیت ہی۔ وہ خطِ استوا پر بھی زندہ رہ سکتا ہی اور بحرِ منجمد شمالی میں بھی۔ موسم اور آب وہوا کو برداشت کرنے میں اُس نے مصنوعی ذرایع سے بہت مدد لی مثلاً زمین کو کھود کر گھر بنانا، کپڑے پہننا، اور غذا مہیّا کرنا یا اُگانا۔

آج کل تمام انواعِ انسانی میں سے صرف ایک نوع باقی ہی یعنی موجودہ بنی نوعِ انسان جو سائنٹفک اصطلاح میں "انسانِ عاقل" کہلاتی ہی دنیا کی تمام "نسلیں" اِسی نوع کی شاخیں ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کو "نسلیں" کہنا ظلم اور غلطی ہی۔ جولین ہکسلے[1] نے بنی نوعِ انسان کی مختلف اقسام کے لیے ایک لفظ تجویز کیا ہی "انسانی گروہ" Ethnic group. لفظ "نسل" کے استعمال کے مقابلے میں اس لفظ کا استعمال زیادہ صحیح ہی۔

ہم نے ابھی ابھی اس کی صراحت کر دی ہی کہ موجودہ انسان جو چوتھے برفانی دؤر میں ظہور پذیر ہوا کسی طرح بھی یوروپین نہیں تھا۔ اُس

---

[1] Julian Huxley and A. C. Haddon: We Europeans.

نے وسط ایشیا یا افریقہ سے یورپ کی طرف رُخ کیا۔ اگر آج افریقہ کے باشندے یا چین کے باشندے اہلِ یورپ سے رنگ یا شکل وصورت یا سر اور آنکھوں کی ساخت میں مختلف ہیں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہی کہ ہر جگہ جغرافیائی حالات کا انسانوں پر اثر پڑا۔[1] اگر استوائی خطّوں میں لوگوں کا رنگ زیادہ تر سیاہ ہوتا ہی تو اس کی یہ وجہ ہی کہ قدرت نے موسم برداشت کرنے کے لیے رنگ اور آنکھوں کی اس ساخت کی سرپرستی کی اور رفتہ رفتہ گورا رنگ اور بھوری آنکھیں اُن خطّوں سے ناپید ہوگئے۔

یورپ کے باشندوں کو تین واضح "انسانی گروہوں (نہ کہ نسلوں) میں تقسیم کیا جاسکتا ہی۔

(۱) بحیرۂ روم (میڈی ٹرے نین) کا گروہ جس کو ایلیٹ اسمتھ Elliot Smith. نے "گندمی رنگ نسل" لکھا ہی۔ اِس گروہ کا رنگ سفیدی مایل سے لے کر ہلکے گندمی تک ہوتا ہی اور کبھی کبھی اچھا خاصا گندمی بھی ہوتا ہی۔ اِس گروہ کے لوگ نہ صرف بحیرۂ روم کے کنارے کے یورپی ملکوں میں بلکہ افریقی اور ایشیائی کناروں کے ملکوں میں بھی آباد ہیں۔ ایلیٹ اسمتھ نے لکھا ہی "قدیم ترین برطانیہ کے باشندے کی ہڈیوں کی کیفیت اگر بیان کی جائے تو یہی کیفیت شمالی لینڈ کے قدیم باشندے کی ہڈّیوں پر بھی صادق آئے گی"۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہی کہ یہ گروہ کس قدر پھیلا ہؤا ہی اور کسی طرح بھی یورپ تک محدود نہیں۔ یہودی اور عرب بھی اسی گروہ سے ہیں اور اسی طرح تمام نام نہاد "سامی نسلوں" کا تعلق اسی گروہ سے ہی۔

---

[1] *Julian Huxley* and *A. C. Haddon*: We Europeans.

(۲) شُمالی یا "نارڈک" گروہ۔ اِس گروہ کی جلد سُرخی مایل سفید ہوتی ہی۔ بال سیدھے اور لچک دار ہوتے ہیں اور بالوں کا رنگ پیلا، بھورا یا سُنہرا ہوتا ہی، آنکھیں نیلی یا بھوری ہوتی ہیں۔ قد اکثر اونچا ہوتا ہی۔ اِس گروہ کے نمونے اسکنڈی نیویا، شمالی یورپ اور جزایرِ برطانیہ میں زیادہ تر ملتے ہیں۔ پہلے اِس گروہ کا وطن وسطِ ایشیا بتایا جاتا تھا، لیکن اب مقبول نظریہ ہی کہ اس کا اصلی وطن جنوبی رُوس تھا اور ایک نظریہ یہ بھی ہی کہ "آریائی" زبان درحقیقت اسی گروہ کی زبان تھی اور اِس نے دوسرے گروہوں میں رائج کی۔ یہ دونوں نظریے بڑی حد تک فرضی ہیں۔

(۳) "یوریشیائی" یا "آلپی" گروہ۔ اِس گروہ کا سر چوڑا اور رنگ سفید ہوتا ہی۔ یہ گروہ ہمالیہ کے شمال سے لے کر ایشیائے کوچک، بلقان، اور یورپ کے وسطی پہاڑوں میں آباد ہیں۔ اس تیسرے گروہ کے اندر چار چھوٹے چھوٹے گروہ شامل ہیں۔

(ا) "آلپی" Alpine. اس گروہ کا سر چوڑا ہوتا ہی، بال سیاہی مایل ہوتے ہیں اور ناک ذرا چوڑی ہوتی ہی۔ قد اوسط ہوتا ہی۔ اس قسم کے لوگ رُوس سے لے کر وسطِ فرانس تک پائے جاتے ہیں۔ اِس گروہ کی مغربی شاخ کو "سلاف" کہتے ہیں۔

(ب) "پامیر" یا "ایرانی" گروہ جو ایران سے لے کر منچوریا تک پایا جاتا ہی۔ اِن لوگوں کی ڈاڑھی گھنی ہوتی ہی۔

(ج) "آرمینی" یا "اناطولی" شاخ جو مشرقِ قریب میں عام ہی۔

(د) یوریشیائی گروہ کی چوتھی شاخ "دیناری" Dinaric. کہلاتی ہی جو بحیرۂ اڈریاٹک کے شمالی سواحل پر عام طور سے پائی جاتی ہی۔

جنوبی پولینڈ اور جرمنی کے بعض حصّوں میں اِس نسل کے لوگ ملتے ہیں۔ اِن لوگوں کا قد اونچا، بال سیاہ اور رنگ گندمی مایل ہوتا ہی اور چہرہ لمبا ہوتا ہی۔

اِن تین بڑے گروہوں کے علاوہ اور بھی کئی گروہ یورپ میں آباد ہیں۔ اِن متفرق گروہوں میں سے ایک "مشرقی گروہ" کہلاتا ہی، اِس گروہ کے لوگوں کا قد میانہ، چہرا چوڑا اور ہڈی دار، جلد سفید، بال اکثر راکھ کے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ناک اکثر اُٹھی ہوئی ہوتی ہی۔ اِس گروہ میں فن، سفید رُوسی، یوکرینی، پول اور اسیتھونی شامل ہیں۔ اِن کے علاوہ یورپ میں تُرکی گروہ بھی ہیں جن کے نمونے بلقان، کریمیا اور ہنگری میں ملتے ہیں۔

اِس مختصر سی سرگزشت سے واضح ہوگیا ہوگا کہ یورپ کی آبادی کسی طرح بھی خالص یورپی نہیں۔ نہ اہلِ یورپ نے بحیثیت نوعِ انسانی کے یورپ میں جنم لیا اور نہ یہ پرانی دنیا کے دوسرے حصّوں یعنی ایشیا اور افریقہ سے نسلاً جُدا رہے۔ برعکس اس کے ایشیا اور افریقہ ہی سے ہجرت کر کے انسان یورپ پہنچا اور یورپ اور ایشیا میں زمانۂ ماقبل تاریخ اور تاریخی زمانے میں برابر ربط وضبط، نسلی اختلاط اور جنگ وجدال (جو بجائے خود اختلاطِ نسلی کا ایک ذریعہ ہی) کا سلسلہ جاری رہا۔ اس لیے شہنشاہیت پرستوں کے تمام نظریے جو اہلِ یورپ کے "خالص" ہونے یا "برتر نسل" سے ہونے پر زور دیتے ہیں سراسر مہمل ہیں۔

(۶)

سفید آدمی کی برتری اور سفید آدمی کے بوجھ کے تمام مفروضات بیشتر دو نظریوں پر مبنی ہیں: (۱) یورپی (سفید یا نارڈک یا آریائی نسل) دنیا کی تمام نسلوں سے ہر لحاظ سے برتر ہی اور اُس کا فرض ہی کہ دُنیا کی

تمام نسلوں پر حکومت کرے۔(۲) نسلی اختلاط اِس یورپی نسل کے لیے حیاتیاتی اور تمدنی نقطۂ نظر سے بہت مُضر ہے۔کیونکہ اس طرح یورپی نسل خود کُشی کرلے گی (واضح ہو اس آخرالذکر نظریے کی اصل بنیاد علٰحدگی پسند شہنشاہیت کی خواہش ہے۔اُن لاطینی الاصل ممالک میں جہاں جاذب شہنشاہیت ہے، جیسے فرانس وغیرہ یہ نظریہ زیادہ مقبول نہیں)

۱۷۷۵ء میں جے۔ایف۔بلومن باخ J. F. Blumenbach. نے جو جرمنی کی مشہور گاٹن گن Gottingen. یونیورسٹی میں پروفیسر تھا، "قاف والی نسل" Caucasian race. کی اصطلاح استعمال کی۔قاف والی نسل سے اس کی مُراد یوروپین نسل تھی، چونکہ اِس نسل کے ایک قدیم آدمی کی کھوپڑی جارجیا واقع قاف سے آئی تھی اِس مناسبت سے اس نے یہ نام تجویز کیا۔اُس کا دیا ہُوا یہ نام تو بہت مشہور ہوگیا،لیکن بلومن باخ کے اصلی اور اہم نظریے کو اُنیسویں صدی کے مصنّفین اور محقّقین نے عمداً فراموش کردیا۔بلومن باخ اس کا قایل تھا کہ تمام بنی نوعِ انسان کی اصل ایک ہے۔نہ صرف جسمانی حدتک بلکہ دماغی حدتک بھی سب کی نسل ایک ہی ہے۔بنی نوعِ انسان کی مختلف اقسام میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ "درجہ" کا ہے "نوع" یا "قسم" کا نہیں۔تمام نسلیں ایک دوسرے سے درجہ بدرجہ ملی ہوئی ہیں۔

۱۸۵۹ء میں چارلس ڈارون کی کتاب Origin of Species. شایع ہوئی اور ۱۸۷۱ء میں اس کی دوسری مشہور کتاب Descent of Man. شایع ہوئی۔شہنشاہیت پسندوں نے بہت جلد ڈارون کے نظریوں کو توڑنا مروڑنا شروع کیا اور مسئلۂ ارتقا مسخ کرکے بتایا کہ

"سفید نسل" انسان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے اور دوسری نسلیں ابھی ارتقا کی کمترین منزلیں طے کر رہی ہیں اور گویا سفید نسل اور بندر کی درمیانی کڑیاں ہیں۔ یورپ نے علوم و فنون میں جو ترقی کی تھی اور دنیا کے بڑے حصے پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی اس کی بنیاد پر انھوں نے یہ فرض کر لیا کہ طبعاً دوسری نسلوں میں اس کی صلاحیت ہی نہیں۔ وہ عمداً تاریخ کو بھی بھول گئے کہ کس طرح عربوں، ترکوں، ہنوں اور منگولوں نے یورپ پر حکومت کی تھی اور ایشیا نے دنیا کو تہذیب و ترقی کے جو سبق دیے تھے وہ اب بھی صرف محققین کو یاد ہیں عوام الناس کا اب بھی یہی خیال ہے کہ یونان میں تہذیب و تمدن کی ابتدا ہوئی اور یورپ کے سوا دنیا کے دوسرے تمام حصے ہمیشہ جاہل و وحشی رہے اور اب بھی جاہل وحشی ہیں چین اور قدیم ہندستان کے عظیم الشان تمدنوں کی داستانیں یورپ کے مدارس کی اضافی کتابوں میں شامل نہیں کی جاتیں۔

جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں (ملاحظہ ہو باب دوم) فرانسیسی مصنف گابی نو نے مختلف نسلوں کی غیر مساوات پر ۱۸۵۵ء میں Essai Sur Einegalite des races huma ines. کے عنوان سے کتاب لکھی جس میں نام نہاد آریائی نسل کی برتری کا قصہ الاپا۔ اس کے بعد لاپوژ Lapouge. نے آریائی نسل اور "نارڈک نسل" کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اسی زمانے میں جرمنی کو جو پہلی جنگِ عظیم کی تیاری کر رہا تھا اس قسم کے نظریوں کی بڑی ضرورت تھی۔ چنانچہ گستاف کوزی نا نے اپنی کتاب اسی مبحث پر لکھی اور اس کی کوشش کی کہ "نارڈک" یا "آریائی نسل" کا اصلی وطن ساحلِ بالٹک قرار دے (حالانکہ بعض محققین

کا خیال تھا اور ہے کہ اِس گروہ کا اصلی وطن جنوبی روس یا وسطِ ایشیا تھا۔
لیکن ساحل بالٹک پر مشرقی پروشیا خود کوزی نا کا وطن تھا) واضح رہے
کہ علم آثارِ قدیمہ کی مدد سے قدیم ترین زمانے کے تمدن کی جہاں تک تحقیق
ہوئی ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اِن حقلوں میں "میڈی ٹرے نین" نسل آباد تھی۔

بہر حال یہ "نارڈک نظریہ" جرمنی میں بہت مقبول ہوا اور
ہوسٹن اسٹیوارٹ چیمبرلین Houston Stewart Chamberlain.
نے اسے اور بھی زیادہ پھیلایا اور اپنی تصانیف کے ذریعے اس کی تبلیغ کی۔
اس طرح جرمنی میں نازی پارٹی کے نظریۂ نسل کا راستہ رفتہ رفتہ صاف
ہو رہا تھا۔

جرمنی کے علاوہ ایک اور ملک میں "نارڈک نسل" کے نظریے کو پھیلانے
کی بہت کوشش کی گئی اگرچہ وہاں اس قدر کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ دوسرا
ملک ریاستہائے متحدہ امریکہ ہے۔

جرمنی کے لیے یہ سوال درپیش تھا کہ برّاعظم یورپ ہی میں اگر ممکن
ہو تو ایک شہنشاہیت قایم کی جائے، تمام باشندے جو جرمن بولتے ہوں
اس سلطنت میں حکمرانوں کی حیثیت رکھتے ہوں اور دوسری اقوام محکوم
ہوں۔ یہ حکمتِ عملی بسمارک کی تھی اور اس نے پہلے پہل نوآبادیاتی شہنشاہیت
حاصل کرنے کے بجائے جرمنی کی بہتری اسی میں دیکھی کہ یورپ میں ایک
زبردست سلطنت قایم کی جائے۔ چنانچہ فرانس سے اس نے السا س
اور لورین کو چھینا، اور ڈنمارک سے شلیسوگ ہول اشتاین کو بعد میں جرمن تجّار اور
سرمایہ دار طبقے کے اثر سے اس نے نوآبادیاتی مقبوضات کی تحصیل کی بھی
کوشش کی لیکن اس کی حیثیت ثانوی رہی۔ قیصر ولیم ثانی کی توجہ اگر

ایک طرف تو نوآبادیاتی مقبوضات کی تحصیل پر تھی تو دوسری طرف یورپ ہی میں جرمن سلطنت کو اوّلین درجہ دینے پر اور ہٹلر کی حکمتِ عملی تو بالکل روشن ہے۔ ظاہر ہے براعظم یورپ میں سلطنت قایم کرنے کے لیے محض "سفید نسل" یا "یورپین نسل" کی برتری کا نظریہ کافی نہیں۔ مزید تخصیص کی ضرورت ہے اور اس تخصیص کی صورت یہ ہے کہ "نارڈک نسل" (جس میں شامل ہونے کا تمام جرمنوں کو دعویٰ ہے) کو نہ صرف دنیا کی دوسری نسلوں بلکہ یورپ کی تمام نسلوں سے برتر سمجھا جاتا ہے۔ صرف "یوروپین" یا "سفید" ہونا کافی نہیں۔ نارڈک ہونا ضروری ہے۔

امریکہ میں دوسرا مسئلہ درپیش تھا۔ وہاں شہنشاہیت کا اتنا زیادہ سوال نہیں تھا۔ اصلی مسئلہ "ہجرت" کا تھا۔ اس کا اندیشہ تھا کہ اگر ایشیا والوں کو امریکہ میں آکے آباد ہونے کی اجازت دی جائے گی تو اپنی کثرتِ تعداد اور اپنے معیارِ زندگی کی پستی کے باعث وہ بہت جلد ملک پر چھا جائیں گے اور ملک کا وہ طبقہ جو اب معاشی حیثیت سے خوشحال ہے خوشحال نہیں رہے گا۔ جو چیز ایک بڑے پیمانے پر ہندستانیوں یا چینیوں کے امریکہ میں آباد ہونے سے پیدا ہوتی ایک چھوٹے پیمانے پر یورپ کے عام باشندوں کی ہجرت سے بھی پیدا ہوتی جو جنگ کے باعث تباہ حال تھے اس لیے مزید تخصیص ضروری تھی۔ امریکہ کے نام نہاد محققین نے "نارڈک نسل" کو سفید نسل یا آریائی نسل کی "جڑ" قرار دیا اور اس امر پر زور دیا کہ صرف "نارڈک نسل" کے باشندوں کو امریکہ آنے کی اجازت دی۔ یہاں ہم یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ امریکہ کے بعض بعض شہروں میں چینیوں اور جاپانیوں کی بہت بڑی آبادیاں ہیں۔ اِن مشرقی لوگوں کا معیارِ زندگی نسبتاً پست ہے اور وہ بہت کم

معاوضے پر محنت کر سکتے ہیں۔ اِس طرح امریکہ کے "سفید" باشندوں کے لیے جن کے ہاتھ میں حکومت ہی سخت قسم کے مقابلے کا امکان تھا۔ اِس امکان کو روکنے کی یہی سب سے سہل صورت تھی کہ ایشیائیوں کو امریکہ میں آباد نہ ہونے دیا جائے۔ دوسری طرف بڑی تعداد میں یہودی اور رُوس اور مشرقی یورپ کے پناہ گزیں باشندے بھی امریکہ پہنچ رہے تھے۔ اِن میں سے جو مالدار تھے ان کو تو ملک خوش آمدید کہنے کے لیے تیار تھا لیکن جو مفلوک الحال تھے ان کی تعداد کی زیادتی سے یہ اندیشہ تھا کہ اس کا اثر ملک کی خوشحالی اور عام معیارِ زندگی پر پڑے گا۔ اس لیے اس قسم کی کتابیں لکھی جاتی تھیں کہ لوگوں میں "غیر نسل" کے باشندوں یا مشرقی نسل کے باشندوں سے تعصب پھیلے اور پھر اِس تعصب کا اثر حکومت پر پڑے۔

اِس قسم کی سب سے زیادہ متعصّبانہ کتاب امریکہ کے ایک مصنّف Medison Grant. نے The passing of the Great Race. کے نام سے لکھی۔ اِس کتاب سے اور تو کچھ ثابت نہیں ہوتا لیکن بقول جولین ہکسلے[1] اگر کچھ معلوم ہوتا ہی تو یہ کہ مصنّف کی شکل وشباہت اور رنگ "نارڈک وضع" کا ہی۔

حیرت ہی کہ امریکہ جیسی جمہوریت "نسل" کے معاملے میں (غالباً محض معاشی وجوہ کی بنا پر) کس قدر تنگ دل ہی۔ یہ اسی سے ظاہر ہی کہ میڈیسن گرانٹ کو نیویارک کی زُووالاجکل سوسائٹی کا صدر نشیں بنایا گیا۔ امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری کا ٹرسٹی اور امریکن جغرافیائی سوسائٹی کا مشیر مقرر کیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہی کہ مسٹر میڈیسن گرانٹ کی کتاب کسی بے لاگ تنقید کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

---

[1] Julian Huxley and A. C. Haddon : We Europeans. ملاحظہ

میڈیسن گرانٹ نے اپنے ایک شاگرد رشید لوتھراپ اسٹوڈارڈ Lothrop Stoddard. کی مشہور و معروف کتاب The Rising Tide of Color. کا مقدمہ تحریر کیا ہی۔ یہاں اس کی گنجایش نہیں کہ ان کے اپنے شاہکار پر تنقید کی جائے، اس لیے ہم صرف اس مقدمے پر نظر ڈالیں گے جو انھوں نے اسٹوڈارڈ کی کتاب پر لکھا ہی۔ اِس مقدمے کی نمایاں خصوصیت یہ ہی کہ تاریخ کو بہت بُری طرح مسخ کیا گیا ہی مثلاً شارل مین کو "نارڈک نسل" کا محافظ اور حامی قرار دیا ہی۔ مسٹر گرانٹ شارل مین اور ہارون الرشید کے تعلقات اور باہمی رسل و رسایل کو بالکل بھول گئے۔

تاریخی واقعات کو جس طرح مسخ کیا گیا ہی ہم اس کی کچھ مثالیں ان کے مقدمے سے نقل کرتے ہیں۔

مسٹر گرانٹ لکھتے ہیں " عربوں نے جب ۷۳۲ء میں بمقام تؤر Tours. نارڈک لوگوں کی مضبوط مسلح صفوں کا مقابلہ کیا تب کہیں جا کے انھیں شکست ہوئی"۔ مسٹر گرانٹ اس امر کو تقریباً بھول گئے کہ شمالی افریقہ میں بھی نام نہاد نارڈک "وِندل" عرصے سے آباد تھے عربوں نے پہلے ان کو مطیع کیا۔ مسٹر گرانٹ لکھتے ہیں کہ اسپین میں نارڈک گاتھ بہت کم تعداد میں تھے۔ یہ کہنا سراسر ظلم ہی۔ صدیوں سے گاتھ جنوبی فرانس اور اسپین میں آباد ہو رہے تھے۔ اسپین میں وِزی گاتھ اور وِندل دونوں نسلیں آباد تھیں جن کو مسٹر گرانٹ ضرور "نارڈک" کہیں گے۔ اور حکومت اِنھیں کے ہاتھ میں تھی۔ تؤر کی شکست کو جدید مورخین کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے[1] اور شارل مین

[1] Henri Pireune : Mohamet et Charlemagne.

کے بعد بھی صدیوں تک عرب جنوبی فرانس پر حملے کرتے رہے اور بہت عرصے تک کئی شہر اُن کے قبضے میں رہے[1]۔ اس کے علاوہ اسپین میں عربوں سے جن لوگوں نے سب سے پہلے آزادی حاصل کی وہ ہرگز نارڈک نہیں تھے بلکہ شمال مغربی اسپین کے لوگ تھے جو "باسک" Basque. کہلاتے ہیں۔ ایک غیر آریائی زبان بولتے ہیں اور جو غالباً یورپ کے اصلی (قدیم ترین) باشندوں کی اولاد سے ہیں۔

تاریخ کو مسخ کرنے کی ایک دوسری مثال یہ ہے کہ مسٹر گرانٹ کے خیال میں چنگیز خاں کے جانشینوں نے پولینڈ تک تو تباہ کر لیا لیکن مشرقی جرمنی میں وال اشٹاٹ Wahlstatt. کی لڑائی کے بعد جو ۱۲۴۱ء میں ہوئی اور جس میں تاتاری ہی جیتے، تاتاریوں کا سیلاب رُک گیا۔ مسٹر گرانٹ کی غلط بیانی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس جنگ میں جیتنے کے بعد تاتاریوں نے اپنے دشمنوں کا بحیرۂ اڈریاٹک کے سواحل تک تعاقب کیا اور اگر انھوں نے مغربی یورپ کو فتح کرنے کی کوشش نہیں کی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے بہت زیادہ زرخیز ممالک اُن کے قبضے میں تھے اور چنگیز خاں کے بعد ہی تاتاریوں کی حکمتِ عملی یہ ہو گئی کہ مفتوحہ ممالک پر حکومت کو مستحکم کیا جائے۔ ہلاکو کی فتوحات مغلوں کی بہیمیت کی آخری نشانیاں تھیں۔ اگر تاتاریوں نے (یعنی چنگیز اور اُس کے قریبی جانشینوں نے) مغربی یورپ کو فتح نہیں کیا تو ہندستان کو بھی فتح نہیں کیا۔ جس طرح وال اشٹاٹ کی فتح کے بعد تاتاری مغربی یورپ کی فتح کی طرح متوجہ نہیں ہوئے اسی طرح جلال الدین خوارزم شاہ کو سندھ کے ساحل پر شکست دینے کے بعد چنگیز خاں نے ہندستان کی تسخیر کا

[1] Henri Pireune : Mohamet et Charlemagne.

ارادہ نہیں کیا حالانکہ ہندستان کی دولت سے بڑھ کے دنیا میں کوئی ترغیب نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ چنگیز التمش کی طاقت سے ڈر گیا؟

تاریخ کو مسخ کرنے کی ایک اور، اور آخری مثال سُنیے "ترکوں نے مشرقی (رومی) سلطنت، بلقانی ریاستوں اور ہنگری کو تو فتح کر لیا لیکن جب ۱۶۸۳ء میں وی آنا کی فصیلوں کے نیچے مغربی یورپ کی نارڈک بہادری سے سابقہ پڑا تو ایشیائیوں کو پھر ایک بار شکست فاش ہوئی"۔[1] یہ تاریخی غلط بیانی گزشتہ مثالوں سے کہیں زیادہ افسوس ناک ہے اور اس کو پڑھ کر امریکہ کے اُن تمام اداروں کی کارگزاری پر شک ہوتا ہے جن کے مسٹر گرانٹ ممبر رہ چکے ہیں۔ ۱۶۸۳ء میں ترکوں کے (دوسرے درجے کے) سپہ سالار قرہ مصطفےٰ کو "نارڈک بہادروں" نے نہیں بلکہ پولینڈ کے نامور اور بہادر بادشاہ سوبیسکی Sobieski. نے روکا۔ مسٹر گرانٹ مشرقی یورپ اور پولینڈ کو مخلوط، نیم ایشیائی اور غیر نارڈک قرار دے چکے ہیں۔ سوبیسکی ہی نے یورپ میں ترکوں کی حکومت پر سب سے کاری ضرب لگائی۔ ۱۶۷۳ء میں (دوسرے محاصرۂ وی آنا سے دس سال پہلے) اُس نے خوزم Khoczim. میں ترکوں کی ایک فوج کو شکست دی جس کا سپہ سالار احمد کوپریلی، قرہ مصطفےٰ سے کہیں زیادہ قابل[2] تھا۔ محاصرۂ وی آنا کے بعد آسٹریوی فوج ترکوں سے لڑتی رہی اس کے کچھ افسر اگر جرمن تھے تو کچھ سیوائے کے[3] رہنے والے تھے اور اطالوی زبان بولتے تھے یعنی غیر نارڈک تھے اور مسٹر گرانٹ سلطان سلیمان اعظم کی فتوحات کو تو بھول ہی گئے۔ آسٹریا کی "نارڈک" سلطنت ۱۶۰۶ء تک ترکوں کی باجگزار رہی۔ معاہدۂ تورُوک Torok. نے ۱۶۰۶ء میں آسٹریا کو اس ذلت آمیز خراج ادا کرنے سے نجات دلائی۔[3]

---

[1] و [2] و [3] H. A. L. Fisher : A History of Europe.

مسٹر میڈیسن گرانٹ کے اس مقدمے سے یہ مثالیں ہم نے محض یہ ظاہر کرنے کے لیے نقل کیں کہ کس طرح تاریخ کو مسخ کیا گیا کہ غلط نسلی نظریوں کو ثابت کیا جائے۔ افسوس یہ ہے کہ یورپ کے فنِ تاریخ نگاری پر اس کا بہت بُرا اثر پڑا ہے اور تعصب کا پردہ اتنا موٹا ہے کہ بے تعصب مستشرقین کی پیہم کوششوں کے باوجود ابھی تک چاک نہیں ہونے پایا تاریخ کی طرح ہر علم و فن کو "نسل" کے غلط نظریوں کی تشہیر کے لیے توڑا مروڑا گیا۔ انتہا ہو گئی کہ حضرتِ عیسیٰ اور اطالوی شاعر دانتے تک کو اِن حضرات نے "نارڈک" قرار دیا ہے۔

لیکن اِن تمام غلط نظریوں اور اِن تمام مفروضات اِس تمام پروپاگنڈے کا باعث جو کچھ ہے وہ کبھی کبھی صاف الفاظ میں ظاہر ہو جاتا ہے چنانچہ میڈیسن گرانٹ نے بھی اسی مقدمے میں اصل حقیقت کا اعتراف کر ہی لیا ہے " امریکہ میں مستقبل کی سب سے بڑی امید مزدور طبقے کے اس احساس پر منحصر ہے کہ نارڈک سے غیر ملکی کا (معاشی) مقابلہ بہت خطرناک ہے، خواہ وہ غیر ملکی جنوبی یا مشرقی یورپ کا غریب باشندہ ہو جو ہجرت کر کے آیا ہو یا وہ نمایاں طور پر خطرناک ایشیائی ہو جس کے پست معیارِ زندگی کی وجہ سے مقابلے میں سفید آدمی کامیاب نہیں ہو سکتا"[۱]

معاہدۂ ورسائی میں سرحدیں زیادہ تر باشندوں کے "نسلی خصایص" کی بنا پر مقرر کی گئی تھیں۔ اسی بنا پر چیکوسلاویکیا کی حکومت قایم کی گئی، سربیا کو بڑھا کر یوگوسلافیہ بنایا گیا۔ بالٹک کی ریاستوں کو آزادی دی گئی لیکن میڈی سن گرانٹ اور اس کے امریکی ہم خیال بھی تاتسیوں کی طرح اس معاہدے

---

[۱] Madison Grant's Introduction to Stoddard's "Rising Tide of Colour."

کے مخالف ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح "نارڈک نسل" کی حکومت کو کمزور کر دیا گیا اور پھر ایشیا کو یورپ پر حملہ کرنے کا موقع ملے گا (واضح ہو کہ "ایشیا" سے اِن لوگوں کی مُراد اشتراکی روس ہی)

مسٹر میڈی سن گرانٹ سے زیادہ دلچسپ مثال ایک اور امریکی مقبول مصنّف اور گرانٹ کے شاگردِ رشید لوتھارپ اسٹوڈارڈ کی ہی۔ اِس شخص کی ذہنی کیفیت کو نفسیاتِ تحلیلی کی اصطلاح میں جنون و خوفِ سزا کہا جا سکتا ہی۔ اِس نے جو کتابیں لکھی ہیں اُن میں سے دو تین بہت مشہور ہیں۔ ایک کتاب اس نے پان اسلامزم کی دھمکی کے متعلق لکھی ہی۔ "تمدّن کے خلاف بغاوت" Revolt against Civilization کے نام سے اِس نے ایک کتاب اشتراکیت کے خطرے کے متعلق لکھی ہی۔ لیکن اس کی جو کتاب سب سے زیادہ دلچسپ ہی اور ہمارے مضمون سے متعلق ہی اس کا نام "رنگ کی بڑھتی ہوئی فوج" The Rising Tide of Color ہی۔ نام نہاد "نسلی سیاسیات" کے علمبرداروں کی طرح اس نے شروع ہی میں کہہ دیا ہی کہ "تاریخ کا بہ غور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہی کہ اُمورِ انسانی میں خاص چیز سیاسیات نہیں، نسل ہی"۔ اُسے اس کا بڑا اندیشہ ہی کہ "رنگ والی" نسلوں میں شرحِ پیدایش بہت زیادہ ہی اور اگر یہ شرح قایم رہی یا بڑھتی گئی تو دنیا کی سفید شہنشاہیت کو بڑے خطرے کا سامنا ہوگا اور یہ نسلیں اُن ملکوں میں آباد ہونے کی کوشش کریں گی جو سفید نسل کی حکومت میں ہیں لیکن جہاں آبادی کی گنجایش ہی (کتاب امریکہ میں لکھی گئی ہی)

پھر اس کے بعد اس نے دنیا کی نسلوں کو رنگ کے لحاظ سے تقسیم کرکے اِس سوال پر معاشی اور جغرافیائی نقطۂ نظر سے خیال آرائی کی ہی۔ مشرقِ بعید

ہیں وہ جاپان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف ہے (۱۹۰۵ء میں جب جاپان نے روس کو شکست دی تو اگرچہ سفید اقوام کی برتری کے نظریے کو ٹھیس لگی، لیکن "زرد خطرہ" کے متعلق طرح طرح کی تاویلیں شروع ہوگئیں۔ یورپ بھر کے مدارس کے طالب علموں نے زرد خطرے کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور سنا ہے اور جنگِ عظیم سے پہلے قیصر ولیم کو بھی اس کا اتنا ہی احساس تھا جتنا زارِ روس کو) اسٹوڈارڈ کا خیال ہے کہ کچھ دنوں کے بعد چین جاپان مل کے ایک ہو جائیں گے اور سفید آدمی کے مقبوضات یا حلقہ ہائے اثر مثلاً آسٹریلیا، جنوبی امریکہ اور شاید شمالی امریکہ پر حملہ کریں گے۔ یہ تو زرد رنگ قوموں کا تذکرہ تھا۔ اس کے بعد وہ "گندمی رنگ کے آدمیوں" کے ممالک کا ذکر کرتا ہے اور اس ملک کی سب سے خطرناک تحریک پان اسلامزم کو قرار دیتا ہے۔ وہ پان اسلامزم سے بلا وجہ اس قدر خائف ہے کہ ہندستان کی قومی تحریک کا ذکر بھی نہیں کرتا اور سرسری طور پر اس کو پان اسلامزم سے وابستہ کہہ کے ٹال دیتا ہے (اس سے مصنف کی معلومات اور استعداد کا اندازہ ہوتا ہے) پان اسلامزم کی جو چیز اسے سب سے زیادہ پریشان کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان نسل کا قایل نہیں۔ نومسلم خواہ حبشی ہو یا چینی، ہندستانی ہو یا یوروپین وہ اس کو ہمیشہ اپنی بیٹی بیاہ دینے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ مصنف کے نزدیک اس کا سب سے خطرناک اثر یہ ہے کہ افریقہ میں جو "سیاہ آدمی" کا ملک ہے اسلام پھیلتا جا رہا ہے اور "افریقہ کا سیاہ آدمی" اسلام کی تعلیم کے باعث ایشیا کے "گندمی رنگ آدمی" کی ماتحتی اور شاگردی میں یورپ اور سفید آدمی کے خلاف بغاوت کرے گا۔ عرب کا پان اسلامزم افریقہ کے کالے آدمی کو یورپ کے خلاف بھڑکائے گا۔ "زرد" "گندمی رنگ" اور "سیاہ فام" آدمی کے سوا نام نہاد "سرخ آدمی"

بھی اس دنیا میں بستا ہے۔ مصنّف کو بڑی خوشی ہے کہ شمالی امریکہ میں اِس "سُرخ آدمی" سے زمین چھین لی گئی اور زیادہ نسلی اختلاط نہیں ہونے پایا۔ لیکن وسط اور جنوبی امریکہ میں جہاں ہسپانوی اور پرتگالی سلطنتیں تھیں اِن اصلی سُرخ باشندوں اور فاتحین میں بڑا نسلی اختلاط ہوا۔ نیم ہسپانوی اور نیم سُرخ امریکی "میس تِت سو" Mestizo. کہلاتے ہیں، جیسے ہندستان میں یورشین۔ ہسپانویوں کے ساتھ بہت سے حبشی غلام اور لونڈیاں بھی تھیں۔ اِن کے میل جول سے جو طبقہ وجود میں آیا وہ "مُلاتو" Mulatto. کہلاتا ہے۔ حبشیوں اور امریکہ کے اصلی باشندوں کے میل جول سے جو طبقہ وجود میں آیا وہ تسامبو Zambo. کہلاتا ہے۔ مصنّف کو اِس نسلی اختلاط کا بڑا افسوس ہے اور اگر خوشی ہے تو محض اس کی کہ ارجنٹائن اور چائل کے بڑے حصّوں میں سفید لوگ آباد ہیں۔ وہ ایک بار پھر یاد دلاتا ہے کہ دنیا کی آبادی کا تہائی حصّہ سفید رنگ ہے اور دنیا میں دس حصّوں میں سے نو حصّے زمین اس نسل کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کی ضرورت ہے کہ "رنگ والی" نسلوں کے اِس بڑھتے ہوئے طوفان کی مخالفت میں مستعدی سے کام لیا جائے ورنہ سفید نسل کے مقبوضات ہاتھ سے نکل جائیں گے "فتح یاب رنگ والی نسلیں اس زمین پر حاوی ہو جائیں گی اور استیصال کرکے یا اپنے آپ میں جذب کرکے سفید آدمی کو بالکل فنا کر دیں گی۔ اس خطرے سے بچنے کی اسٹوڈارڈ نے تین ترکیبیں سوچی ہیں۔ ان تینوں پر عمل ضروری قرار دیا ہے۔ پہلے تو یہ کہ ورسائی کے معاہدے کو ختم کر دیا جائے ورنہ ساری دنیا کو خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ (۲) دوسرے یہ کہ ایشیا کی نوخیز قوموں سے معاہدے کر لیے جائیں، سفید اقوام ایشیا پر دوامی قبضے کے دعوے سے دست بردار ہو جائیں اور ایشیا والے اس سمجھوتے پر

تیار ہو جائیں کہ وہ افریقہ اور لاطینی امریکہ پر قبضہ کرنے یا ان ممالک میں آباد ہونے کے ارادے چھوڑ دیں۔ تیسرے یہ کہ سفید دنیا میں جہاں کہیں کمتر قسم کے انسان گھس آئیں ان پر سخت پابندیاں عاید کی جائیں۔ (جیسے ممالکِ متحدہ امریکہ میں حبشی)

اس کتاب سے زیادہ شاید ہی کوئی اور کتاب "نسلی سیاسیات" کے نظریے کی حماقتوں کو اور زیادہ واضح طور پر پیش کرتی ہو۔

لیکن سچے محققین اور سائنس دانوں نے جب اس مضمون پر روشنی ڈالی تو معلوم ہوا کہ یہ تمام نظریات کس قدر مہمل اور بے بنیاد ہیں۔ پروفیسر شنائیڈر نے اپنی "تاریخِ تمدنِ عالم" میں اس امر پر زور دیا ہے کہ ہر قدیم تمدن کے عروج کا زمانہ وہ ہے جب مختلف انسانی گروہوں میں آپس میں نسلی اختلاط ہوتا ہے۔ فاتح اور مفتوح کے ملاپ سے نئے تمدن کی بنیاد پڑتی ہے۔ جولین ہکسلے نے بھی اس پورے مسئلے کی حیاتیاتی نقطۂ نظر سے جانچ کرنے کے بعد یہ رائے دی ہے "ہم بلا خوفِ تردید زور دے کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی انواع میں نسلی اختلاط ہرگز نقصان دہ نہیں اور ہر ایسے گروہ میں جس نے تاریخ میں نمایاں کام کیے اس طرح کا اختلاط ہوا" یورپ میں غیر یورپی گروہوں سے جو تعصبات ہیں وہ زیادہ تر معاشی اور معاشری اور اس قسم کی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔ یورپ کے لاطینی ممالک میں دوسری نسلوں سے زیادہ تعصب نہیں پایا جاتا۔ پرتگال میں افریقی نسل (حبشیوں) سے بہت میل جول ہوا اور یہ حبشی زیادہ تر غلام تھے۔ اشتراکی روس میں نسلی امتیاز کو جرم اور مذموم قرار دیا جاتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ اگر بعض ممالک میں دوسری نوع کے گروہ سے تعصب ہے تو وہ "حیاتیاتی" نہیں بلکہ "معاشری" ہے۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک نوع کے مردوں کو دوسری

نوع کی عورتوں میں، اور ایک نوع کی عورتوں کو دوسری نوع کے مردوں میں بڑی کشش معلوم ہوتی ہے۔ جو ہندستانی یا چینی یا حبشی طالب علم یورپ ہو آئے ہیں اُنھیں اس کا تجربہ ہوگا اور اس کے برخلاف اہلِ اسپین یا یورپ کے دوسرے باشندوں نے دوسری انواع کی عورتوں سے جس کثرت سے شادیاں کی ہیں اس سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح اگر "نسلی اختلاط" پر کہیں ناراضی کا اظہار کیا جاتا ہے تو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی وجہ معاشری ہوتی ہے نہ کہ حیاتیاتی۔

اکثر اس قسم کے مہمل اعتراضات کیے جاتے ہیں کہ دوغلے لوگ ناقص قسم کے ہوتے ہیں۔ اُن میں دونوں نسلوں کی خامیاں ہوتی ہیں اور کسی کی خوبیاں نہیں ہوتیں۔ دوغلے ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان حالات میں بھی وجوہات معاشرتی ہوتے ہیں۔ ایسے ملکوں میں جہاں نسلی اختلاط کو معاشری بنا پر مذموم قرار دیا جاتا ہے ظاہر ہے دوغلوں کو نہ حاکم قوم اپنا سمجھتی ہے اور نہ محکوم اپنے طبقے میں گنتی ہے۔ اس کا معاشی اور معاشرتی اثر اس دوغلے طبقے پر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ طبقہ جو امریکہ میں یورپی اور حبشی عناصر کے میل جول سے وجود میں آیا ہے۔ اِس طبقے میں بجائے خود کوئی نقص نہیں اور ان میں سے کئی نے غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ لیکن ان کے لیے نہ حکمران یورپی طبقے میں کوئی جگہ ہے اور نہ حبشی طبقے میں یا مثلاً ہندستان میں یوریشین (جو ہندستان میں اینگلو انڈین کہلاتے ہیں) بلا وجہ اس طبقے کو اس قدر صلواتیں سنائی جاتی ہیں۔ اس طبقے کا کوئی فرد کسی عام ہندستانی یا انگریز فرد سے حیاتیاتی اعتبار سے کم نہیں لیکن ہندستان جیسے ملک میں اُن کے لیے نہ انگریزوں کے طبقے میں کوئی جگہ ہے نہ

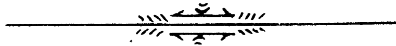
ہندستانیوں کے طبقے میں جو ان کو (ان کے تمدّن کی وجہ سے) غیر سمجھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ یہ کامل طور پر انگریزی تمدّن اختیار کر سکتے ہیں نہ ہندستانی تمدّن۔ جن ملکوں میں نسلی اختلاط کو بُرا نہیں سمجھا جاتا وہاں یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا مثلاً پرتگال، اسپین، فرانس، اسلامی ممالک اور روس۔

جس طرح نسلی اختلاط کی علمِ حیاتیات کوئی مخالفت نہیں کرتا اُسی طرح تاریخ "نارڈک" نسل کے دعوائے برتری کو تسلیم نہیں کرتی۔ پہلے تو "نارڈک نسل" کا وجود ہی معرضِ بحث میں ہے۔ ایک نوعِ انسانی ایسی ضرور ہے جو غالباً ایک حد تک جغرافیائی اور دوسرے اثرات کے باعث وہ خصوصیات رکھتی ہے جو "نارڈک" نسل کی خصوصیت سمجھی جاتی ہیں۔ پھر بھی اتنا نسلی اختلاط ہوتا رہا ہے کہ یہ نوع کسی طرح خالص نہیں۔ پھر اس کے دعوائے برتری کو کیونکر صحیح تسلیم کیا جائے۔

اس کے علاوہ دنیا کے قدیم ترین تمدّن اُن لوگوں کے تھے جو کسی طرح بھی "نارڈک" نہیں کہے جا سکتے جیسے مصری، اشوری، کلدانی، اہلِ بابل، چینی، جاپانی، ہندوی (ڈراویڈی) فونیقی اور یہودی۔ آج کل نازی جرمنی کا دعویٰ ہے کہ ہر بڑا انسان "نارڈک نسل" کا ہے لیکن اگر ہم نپولین اور شکسپیر کی تصویریں دیکھیں تو اُن میں کہیں "نارڈک نسل" کی صفات نظر نہیں آتیں۔ جرمنی کے بڑے بڑے افراد جیسے گوئٹے، بیت اوون اور کانٹ کی تصویریں بھی کسی طرح "نارڈک نسل" آدمیوں کی تصویریں نہیں معلوم ہوتیں۔

اور بہ فرضِ محال اِن تمام مہمل نظریات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ایک سوال باقی رہ جاتا ہے جس کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔ کیا کسی ایک

"نسل" کو اس کا حق حاصل ہی کہ وہ محض اِس جُرم کی بنا پر کہ دوسری "نسل" اُس سے مختلف ہی اس کو فنا کرنے اور مِٹانے کی کوشش کرے۔ لیکن حقیقت یہ ہی کہ کسی "نسل" یعنی انسانی گروہ کو کسی دوسرے گروہ سے فطرتاً یا طبعاً کوئی بغض یا عِناد یا عداوت نہیں ہوتی۔ معاشی وجوہ کے باعث عوام النّاس میں تعصّبات پیدا کرنے اور تعصبات کا پروپاگنڈا کرنے کے لیے نسل کو بھی ایک بہانہ بنالیا گیا ہی۔ عملی سیاسیات میں اس کا ایک بڑا فایدہ یہ ہی کہ اگر محکوم ملک کسی الگ "نسل" سے ہو تو اس کے باشندے حقیر سمجھے جاتے ہیں اور اِس طرح حاکم ملک کے مزدور پیشہ طبقے کی بھی تھوڑی سی تشفّی ہو جاتی ہی۔ اور تھوڑا سا معاشی فایدہ بھی پہنچ جاتا ہی۔



پانچواں باب

رومتہ الکبریٰ کی روایات

(۱)

رومتہ الکبریٰ کے تمدن نے مغربی بحیرۂ روم کے یورپی ممالک یعنی فرانس، اطالیہ، اسپین اور پرتگال پر بہت گہرے اثرات چھوڑے۔ اِن ممالک کی زبانیں لاطینی سے نکلیں۔ ان کے تمدن کو لاطینی تمدن اور خود ان ممالک کو اکثر لاطینی ممالک کہا جاتا ہے۔ اِن ممالک نے صرف رومتہ الکبریٰ کے تمدن ہی کو برقرار نہیں رکھا بلکہ مشرق کے عرب تمدن سے بھی انھیں بہت واسطہ رہا اور اس طرح رومتہ الکبریٰ کی روایات ایک اور ذریعے سے بالواسطہ اِن تک پہنچتی رہیں۔

اِن روایات میں جاذب شہنشاہیت کے اصول بھی شامل تھے۔ اِن ممالک کا بحیرۂ روم کے اُس پار کے ممالک سے ہمیشہ تجارتی ربط ضبط رہا اور وہ غیر یورپی اجنبیوں سے نسبتاً زیادہ مانوس رہے۔ اس کے علاوہ عربوں نے صدیوں تک اسپین پر اور بیسیوں سال تک جنوبی فرانس پر حکومت کی۔ عرصۂ دراز تک صقلیہ (سسلی) اور جزایر بے لبارک ان کے قبضے میں رہے اور انھوں نے بارہا اطالیہ پر چڑھائی کی۔ اِن تمام لڑائیوں اور حملوں کے ساتھ تمدن کے ربط ضبط کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہی چنانچہ آج بھی ان تمام ممالک میں اسلامی تمدن کی نشانیاں صاف صاف نظر

آتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اختلاطِ نسل بھی ہوتا رہا اور اِن تمام ممالک میں ایسے لوگ بکثرت نظر آتے ہیں جو سفید فام عربوں سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔

اگرچہ اسپین، فرانس اور پرتگال کی شہنشاہیتیں بھی معاشی اور سرمایہ دارانہ شہنشاہیتیں تھیں اور ہیں اور اِن ممالک نے بھی نوآبادیوں پر حکومت کی اور اُن کو بسایا۔ لیکن اِن ممالک کے باشندے کبھی بھی "سفید آدمی" کی برتری کے زیادہ قایل نہیں رہے اور نہ کبھی انھوں نے نسلی اختلاط سے احتراز کیا۔ شمالی یورپی گروہوں کے مقابل یہ لوگ ذرا سانولے ہیں اس لیے سانولی رنگت یا دوسرے رنگوں کے لوگ انھیں نسلاً اتنے بعید نہیں معلوم ہوتے جتنے انگریزوں یا جرمنوں کو۔

اِن ممالک کی سلطنتوں کا نظام یہ ہے کہ "تمدن" کے چند عارضی درجے طے کر کے ہر نوآبادی کے افراد، حکمران قوم کے افراد کے برابر ملکی حقوق حاصل کر لیتے ہیں۔ اِن میں سے اکثر ملکوں کی پارلیمان میں نوآبادیوں کے نمایندے شریک ہیں۔ اور محکوم اقوام کے افراد کے لیے سرکاری ملازمتوں یا پیشوں میں کوئی قیود نہیں۔

ہاں اگر محکوم اقوام حاکم سلطنت کے خلاف بغاوت یا شورش کی کوشش کرتی ہیں تو بڑی سختی کے ساتھ سرکوبی کی جاتی ہے۔ سیاسی مظالم ضرور ہوتے ہیں لیکن ان کی بنیاد "نسل" پر نہیں ہوتی۔

نسلی اختلاط خود اِن ملکوں میں بھی بہت ہے اور نوآبادیوں میں بھی بہت زیادہ ہے۔ اِن ملکوں میں نسلی اختلاط کو قطعاً مذموم نہیں سمجھا جاتا۔ کوئی حبشی اگر تعلیم یافتہ اور خوش حال ہو تو اچھے فرانسیسی خاندان میں شادی کرتا ہے اور لوگ اس کو مذموم نہیں سمجھتے۔ نوآبادیوں میں تو نسلی اِختلاط

اور بھی زیادہ ہے اور اس طرح جو مخلوط طبقہ وجود میں آتا ہے وہ اینگلو انڈین (یوریشین) یا امریکہ کے نیم حبشی طبقے کی طرح حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

اِن سلطنتوں کا اپنی محکوم قوموں سے جو سلوک ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علیحدگی پسند شہنشاہیت جس کی بنیاد نسلی امتیاز پر ہو دورِ جدید کی سرمایہ دارانہ شہنشاہیت کے لیے قطعاً ضروری نہیں۔ فرانس نے پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں بہت بڑے پیمانے پر اپنے محکوم باشندوں کی فوجوں کو مغربی محاذ پر بھیجا اور یہ لوگ فرانسیسی سپاہیوں کے دوش بدوش لڑتے رہے۔ اسپین میں جنرل فرانکو نے مراکو کے سپاہیوں کو خود اپنے ہم وطنوں کا سر کچلنے کے لیے استعمال کیا۔

ان سلطنتوں کے معاشی نظام کا دارو مدار بھی علیحدگی پسندی پر نہیں۔ محکوم اقوام کے متموّل اور تعلیم یافتہ طبقوں کو مساوات کا درجہ دے کر اور شریکِ حکومت بنا کے یہ سلطنتیں ان کو اپنے معاشی نظام میں شریک کر لیتی ہیں۔ اور ایسی نفسیاتی کیفیتوں کے پیدا ہونے کا موقع بہت کم دیتی ہیں کہ محکوم قوم بحیثیت نسل یا گروہ اپنی ذلّت محسوس کرے اِن سلطنتوں میں بھی محکوم اقوام لوٹی جاتی ہیں لیکن ان کی ذلّت نہیں کی جاتی۔

اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اِن ملکوں میں قومیت اور وطن پرستی کی تحریکوں کو زیادہ تقویت نہیں پہنچنے پاتی۔ چونکہ محکوم اقوام کے جذبات کو زیادہ ٹھیس نہیں لگتی، اِس لیے اِن اقوام کے عوام النّاس کو اُبھارنا دشوار ہوتا ہے اور قومی لیڈروں کو قومی تحریکیں پھیلانے میں دِقت ہوتی ہے۔ اِن سلطنتوں کے مقبوضات میں قومی تحریک کا دارومدار زیادہ تر معاشی وجوہ پر ہوتا ہے، زخم خوردہ قومیت کے احساس پر نہیں۔

(۲)

رومۃ الکبریٰ اور مشرقی رومی سلطنت کے بعد یورپ کے جس ملک نے پہلے دنیا کے دوسرے ممالک پر قبضہ کیا اور سلطنت قایم کی وہ اسپین ہی۔ اسپین میں عربوں کی آخری سلطنت کو ختم کرنے کے بعد ملک میں ایک نئی روح سی دوڑ گئی۔ کچھ عرصے کے بعد حکومتِ اسپین ہی نے کولمبس کے لیے زادِ سفر فراہم کیا اور امریکہ دریافت ہوا۔ ظاہر ہی اس نئے برِ اعظم پر حکومت جمانے کا سب سے پہلے اسپین اور اس کے بھائی پرتگال کو موقع ملا۔

شمالی امریکہ کے اصلی باشندوں نے تو کسی بڑے تمدن کی بنیاد نہیں ڈالی تھی، لیکن جنوبی امریکہ میں اِنکا .Inca سلطنت اُس حصے میں واقع تھی جس کو اب پیرو .Peru کہتے ہیں۔ اِن لوگوں نے ایک عجیب و غریب تمدن کی بنا ڈالی تھی جس کے آثار دیکھ کے حیرت ہوتی ہی۔ اِس تمدن کی یادگاریں کسی طرح بابل و نینوا کی یادگاروں سے کم دلچسپ اور حیرت افزا نہیں لیکن اسپین کی مٹھی بھر فوج نے اِس سلطنت کا تختہ چند گھنٹوں کے اندر اُلٹ دیا۔ اسی طرح جنوبی امریکہ کے اصلی باشندوں کی ایک اور حکومت .Azetic اسپین کے سپاہیوں کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔ میکسیکو کی پُرانی سلطنت کا بھی یہی حشر ہُوا۔

اہل اسپین جو خود اپنے ملک میں غیر عناصر کو دیکھتے تھے، جلد امریکہ کے اصلی باشندوں میں گھلنے ملنے لگے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ شروع شروع میں انھوں نے اِن اصلی باشندوں سے بہت بُرا سلوک کیا۔ سونے کی طمع اس کا بڑا سبب تھی۔ اس کے علاوہ ہر فاتح قوم مفتوح قوم سے شروع شروع میں یہی سلوک کرتی ہی۔ جاذب شہنشاہیت یا علیحدگی پسند شہنشاہیت

کا سلسلہ بعد میں شروع ہوتا ہے۔ اہلِ اسپین نے شروع میں امریکہ کے اصلی باشندوں پر جو مظالم کیے اس کی مذہبی تاویل انھوں نے یہ کی کہ امریکہ کے یہ اصلی باشندے حضرت نوح کے تین بیٹوں حام، سام، یافث میں سے کسی کی اولاد نہیں اور اس لیے حضرت آدم و حوّا کی اولاد سے بھی نہیں[1]۔ اس لیے اُن پر ہر طرح کا ظلم روا ہے۔

لیکن حکومتِ اسپین کی یہ عارضی حکمتِ عملی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ بہت جلد حکمرانِ ہسپانوی، امریکہ کے اصلی باشندوں میں گھُل مِل گئے۔ میکسیکو اور پیرو کے باشندوں کو اہلِ اسپین سے شادی بیاہ کرنے کی اجازت دی گئی اور اس طرح جو طبقہ وجود میں آیا وہ کریول Creole. کہلاتا ہے۔ یہ مخلوط نسل کم و بیش تمام وسط امریکہ میں پھیل گئی۔ جنوبی امریکہ میں مخلوط طبقہ Mestizo. کہلاتا ہے۔

اِس نسلی اختلاط کے باعث جنوبی امریکہ کی نسلی حالت اب یہ ہے کہ مجموعی طور پر لاطینی امریکہ کو "سفید آدمی کی زمین" نہیں کہا جا سکتا۔ میکسیکو میں سفید فام آدمی تقریباً پانچ فی صدی ہیں۔ بولیویا، پیرو، ایکوے ڈر سب اصلی امریکہ نسلیں ہیں اور حکمران طبقہ سفید فام یا مخلوط ہے۔ کولمبیا اور پیراگوئے کی آبادی زیادہ تر مخلوط ہے[2] جنوبی ریاستوں میں سفید فام لوگوں کی اکثریت ہے۔

علیحدگی پسند شہنشاہیت کے حامی ہمیشہ جنوبی امریکہ کی مثال دے کے جاذب شہنشاہیت کی مذمّت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محض اختلاطِ نسلی

---

[1] J. Huxley and A. C. Haddon : We Europeans.

[2] P. T. Moon : Imperialism and World Politics.

کے باعث اسپین نے جنوبی امریکہ میں اپنی سلطنت کھوئی لیکن یہ اعتراض غلط اور اصل واقعہ اس کے برعکس ہے۔ اِن ملکوں میں خود ہسپانوی اور مخلوط حکمران طبقوں نے بغاوت کی اور ان کی بغاوت بالکل ہی ایسی تھی جیسے شمالی امریکہ میں اُن انگریزی نوآبادیوں کی بغاوت (جو بعد میں ریاستہائے متحدہ امریکہ بنیں)

اِدھر اسپین یورپ میں اس قدر کمزور ہوگیا تھا کہ اپنی نوآبادیوں کی حفاظت نہیں کرسکتا تھا اور جنوبی امریکہ کی سلطنت کے ہاتھ سے نکل جانے کے اور پھر ہاتھ نہ آنے کا اصلی سبب برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ کی حکمت عملی تھی۔ انھوں نے پہلے "کیننگ طریقہ" اور پھر "منرو مسلک" نکالے اور اِنھیں اصولوں کی بدولت جنوبی امریکہ آج تک آزاد ہے[۱]۔

اِسپین کی جاذب شہنشاہیت پر دوسرا بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مقابلے میں جنوبی امریکہ نے بہت کم ترقی کی۔ تمدن کی اس پستی کا باعث نسلی اختلاط کو قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اعتراض بھی غلط ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مقابلے میں کناڈا نے بھی بہت کم ترقی کی جو اتنا "مخلوط" نہیں ہونے پایا تھا۔

(۳)

اسپین کی طرح پرتگال کی نوآبادیوں میں بھی بہت نسلی اختلاط ہوا برازیل میں وہی صورت پیدا ہوئی جو پیرو اور میکسیکو میں پیدا ہوئی تھی۔ ہندستانی نوآبادی گوآ میں بھی پرتگالی محکوم قوم سے بہت ملے جلے[۲]۔ اور خود پرتگال میں حبشی غلاموں سے بہت نسلی اختلاط ہوا جس کی وجہ سے

---

[۱] P. T. Moon : Imperialism and World Politics.

[۲] *Julian Huxley and A. C. Haddon* : We Europeans.

پرتگال کی آبادی میں اچھا خاصا حبشی جزو شامل ہو گیا ہے۔[1]

(۴)

امریکہ کی دریافت کے بعد سے لے کر اب تک فرانس کی دو بیرونی سلطنتیں قائم ہوئیں ان میں سے پہلی شہنشاہیت کے مقبوضات میں شمالی امریکہ کا وہ خطہ تھا جو اب فرانسیسی کناڈا کہلاتا ہے۔ ۱۷۶۳ء میں انگلستان نے فرانس کی اس نوآبادی پر قبضہ کر لیا۔ ہندستان پر فرانس کا جو اثر تھا وہ اور جو فرانسیسی مقبوضات تھے وہ بھی انگریزوں کے پاس منتقل ہو گئے۔

نپولین کی سلطنت براعظم یورپ میں تھی اور اس سے ہمیں یہاں کوئی واسطہ نہیں۔

فرانس کی دوسری نوآبادیاتی شہنشاہیت بعد میں شروع ہوئی۔ اور بجائے امریکہ کے شمالی افریقہ میں پھیلی۔ مصر اور طرابلس کے سوا شمالی افریقہ کے تمام تر ممالک فرانس کے قبضے میں ہیں یعنی الجزائر، تونس اور مراکو (مراکو کا ایک حصہ اہلِ اسپین کے قبضے میں ہے) صحرائے اعظم کا پورا مغربی حصہ اور مغربی افریقہ کا بیشتر حصہ فرانسیسیوں کے قبضے میں ہے۔ مشرقی افریقہ میں عدن کے بالمقابل فرانسیسی شمالی لینڈ ہے جو برطانوی اور اطالوی شمالی لینڈ سے رقبے میں بہت کم ہے لیکن جس کی بندرگاہ جبوتی کو یہ خاص اہمیت حاصل ہے کہ وہ حبش کے پایہ تخت عدیس ابابا سے بذریعہ ریل ملا ہوا ہے۔ ایشیا میں چند ہندستانی بندرگاہوں کے علاوہ ہندچینی کا زرخیز جزیرہ نما فرانسیسیوں کے قبضے میں ہے۔ جنوبی امریکہ میں

[1] Julian Huxley and A. C. Haddon : We Europeans.

گائنا کا تھوڑا سا حصہ فرانسیسی قبضے میں ہی اور اس کے علاوہ بکثرت جزایر پر فرانسیسی قبضہ ہی۔

یہاں ہمیں اس دوسری فرانسیسی نوآبادیاتی شہنشاہیت کی تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہی کہ ہم دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر فرانسیسی سلطنت کے مستقبل کے متعلق خیال آرائی کریں۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہی کہ فرانس کی حکومت اور فرانسیسی بحیثیت حاکم، محکوم قوموں سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔

"کوئی قوم یا کہیں کے باشندے فرانسیسیوں کے برابر نوآبادی کے نظریات یا نوآبادیوں کی خوشحالی بڑھانے کے ذرایع پر غور نہیں کرتے[1]۔ نہ صرف عہدیداران متعلقہ تعلیمی ادارے، معاشیئیں اور اخبارات سب نوآبادیوں کے معاملات میں بہت گہری دلچسپی لیتے ہیں۔" فرانسیسی لیڈروں نے دیسی نسلوں سے ایک خاص حکمتِ عملی کی بنا پر اپنے تعلقات استوار رکھے اور ہمیشہ ان سے انسانیت کا برتاؤ کیا اور اُن کا خیال رکھا۔[2] فرانسیسیوں میں اس کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہی کہ نئے ملکوں میں اپنے آپ کو اس طرح ڈھال لیں جیسے اُس ملک کے باشندے۔ وہ محض تعصب کی بنا پر محکوم ملکوں کے تمدن کو حقیر نہیں سمجھتے۔ فرانسیسی تمدن میں شمالی افریقہ کے تمدن کی بہت سی نشانیاں صاف نظر آتی ہیں اور ہندستانی مسافروں کو فرانس میں "مشرقیت" کا نمایاں طور پر احساس ہوتا ہی۔ شمالی افریقہ کی نوآبادیاں تو تقریباً فرانس ہی کا ایک حصہ سمجھی جاتی ہیں اور "سمندر پار کا فرانس" La France d'outre mer. کہلاتی ہیں۔ پیرس کے بعض حصّوں مثلاً بلوار ساں مشیں کو دیکھ کر خیال ہوتا ہی کہ پرانے رومتہ الکبریٰ

---

[1] و [2] V. Shiva Ram : Comparative Colonial Policy.

کا بھی یہی حال ہو گا اور مختلف رنگ روپ اور تمدّن کے لوگ اسی طرح بلا تکلف ایک دوسرے سے ملتے جُلتے ہوں گے۔

فرانس کی یہ کیفیت صرف معاشری ربط وضبط کی حد تک محدود نہیں۔ فرانس کی حکمتِ عملی سرکاری اور سیاسی طور پر اس کی کوشش کرتی ہے کہ رفتہ رفتہ مقبوضات کو ملک میں جذب کر لیا جائے۔ وہ برطانیہ کی طرح سلطنت کے دُور دراز حصّوں کو حکومتِ خود اختیاری یا "ڈومینین" کا مرتبہ دینے کی قایل نہیں[۱] لیکن اِن دُور دراز حصّوں کے نمایندے فرانس کی پارلیمان میں موجود ہیں۔ برخلاف اس کے برطانیہ کے کسی ڈومینین کا نمایندہ برطانوی پارلیمان کا رکن نہیں بن سکتا۔[۲] ریاستہائے متحدہ امریکہ نے فلی پائن اور پورتوریکو کو یہ حق دیا ہے کہ وہ واشنگٹن کے "ایوانِ نائبین" میں شرکت کے لیے کمشنروں کو بھیجیں، لیکن یہ کمشنر ایوان کے رُکن نہیں تصوّر کیے جاتے اور انھیں رائے دہی کا حق بھی حاصل نہیں۔[۳] برطانوی اور امریکی شہنشاہیت کے اصول کے بالکل برخلاف فرانسیسی مقبوضات کے وکیل Deputies. اور عماید Senators. کا فرانسیسی ایوانوں میں بالکل وہی درجہ ہوتا ہے جو فرانسیسی نمایندوں یا عماید کا ہوتا ہے۔ انھیں رائے دہی کا حق بھی فرانسیسیوں کی طرح ہوتا ہے۔[۴] الجزائر کے نمایندوں کے علاوہ چار ارکان اور دس نمایندے فرانس کے دو ایوانوں میں مقبوضات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ مقبوضات ری یونانیاں Reunion. مارتی نیک Martinique. گوادالوپ Guadaloupe. ایک ایک نمایندے اور ایک ایک رُکن کو فرانس بھیجتے ہیں۔ ہندستان کی

W. B. Munro: The Government of Europe. [۱] و[۲] و[۳] و[۴]

فرانسیسی بندرگاہوں سے ایک نمایندہ اور ایک رکن بھیجا جاتا ہے۔ سینی گال Senegal. گائنا Guiana. اور ہند چینی سے ایک ایک نمایندہ ایوانِ نمایندگاں کو بھیجا جاتا ہے۔ لیکن کوئی رکن نہیں بھیجا جاتا[1]۔ مقبوضات کے نمایندوں کا انتخاب انھیں مقبوضات کے وہ باشندے کرتے ہیں جنھیں فرانسیسی حقوقِ ملکی حاصل ہوتے ہیں، اِن میں ملک کے دیسی باشندوں کی بھی بڑی تعداد شامل ہوتی ہے کیونکہ چند خصوصیات (مثلاً تعلیم وغیرہ) کے حاصل کرنے کے بعد دیسی باشندوں کو فرانسیسی حقوقِ ملکی مل جاتے ہیں۔ مدغاسکر میں عام باشندوں کے لیے ابتدائی تعلیم لازمی ہے[2]۔

پرانی روایات کے علاوہ دو بہت بڑی معاشی اور سیاسی وجوہ ایسی ہیں جو فرانس کی جاذب شہنشاہیت کی طرف کھینچتی ہیں۔ ایک تو فرانس کا جغرافیائی محلِ وقوع کہ وہ یورپ کی کئی طاقتور سلطنتوں سے گھرا ہوا ہے جن سے مقابلہ کرنے کے لیے اُسے شمالی افریقہ کے مقبوضات سے ربط و ضبط بڑھانے اور وہاں سے اپنی فوجوں کے لیے آدمی اور ان کی خوراک فراہم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ دوسری وجہ فرانس کی گھٹتی ہوئی شرحِ پیدائش ہے۔ اپنی آبادی بڑھانے کے لیے اہلِ فرانس مقبوضات کے باشندوں، خصوصاً شمالی افریقہ کے بربر اور عرب باشندوں سے نسلی اختلاط کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اگرچہ فرانس کے بعض مصنفین نے وقتاً فوقتاً نسلی امتیاز اور علیحدگی پسند شہنشاہیت کی تعریف میں کتابیں لکھیں، اِن میں سے گابی نو اور لاپوژ کا ہم ذکر کر چکے ہیں، لیکن اِن کتابوں کا اثر فرانس میں بہت کم ہوا اور

---

[1] W. B. Munro: The Government of Europe.

[2] P. T. Moon: Imperialism and World Politics.

فرانس کے باہر زیادہ ہوا۔ فرانسیسی ہمیشہ نسلی اختلاط اور حاکم اور محکوم قوموں کے میل جول کے قایل رہے۔ بعض فرانسیسی مصنفین نے اس میل جول پر زور دیا اور رومتہ الکبریٰ بلکہ اسلام کی شہنشاہیت کی مثال کو سبق کے طور پر پیش کیا۔[ا] فرانسیسی مصنفین ہی نے پہلے اہلِ یورپ کو عربوں کے تمدن کی عظمت سے روشناس کرایا۔

(۵)

اطالیہ بہت بعد میں نوآبادیاتی شہنشاہیت کے میدان میں آیا۔ اطالیہ رومتہ الکبریٰ کی سلطنت کا گہوارہ تھا اور اُس کے بعد عیسائی تمدن کا گہوارہ بنا۔ لیکن رومتہ الکبریٰ کی شہنشاہیت سے پہلے سے اطالیہ میں غیر معمولی نسلی اختلاط ہوتا رہا۔ شمالی اطالیہ کے باشندے اِٹروسکی Etruscans. دراصل لیڈیا واقع ایشیائے کوچک سے آئے تھے۔ اطالیہ کے ساحلی بندرگاہوں پر فونیقیوں اور یونانیوں نے نوآبادیاں قایم کیں۔ اطالیہ کے جزایر صقلیہ (سسلی) شارڈمینیا اور کارسیکا میں بھی حملہ آور قومیں قبضہ کرتی اور بستی رہیں۔ گاتھ اور ونڈل، قرطاجنی اور عرب سبھی قسم کے لوگ تاریخی زمانوں میں اطالیہ میں آباد ہوتے رہے۔ اُنیسویں صدی تک اطالیہ کے بڑے بڑے حصّوں پر آسٹریا کی حکومت تھی۔ نسلی اختلاط کی حد تک اطالیہ کسی طرح اسپین سے کم نہیں رہا۔

اُنیسویں صدی عیسوی میں جب مغربی یورپ کی دوسری طاقتیں دنیا بھر میں نوآبادیوں کا جال پھیلا رہی تھیں، اطالیہ ایک متحدہ ریاست بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اطالوی اتحاد اور ایک ریاست بننے کی کوشش کو اہلِ اطالیہ

[ا] *P. J. Andreas*:—Islam et les Races.

"ریسارجی منتو" Risorgimento. کہتے ہیں اور اس کی ان کی تاریخ میں وہی اہمیت ہی جو اہلِ اسپین کی تاریخ میں فتوحات کے اُس سلسلے کی ہی جس کے اختتام پر وہ عربوں کو بے دخل کرکے پھر سے اپنے ملک کے مالک بن گئے۔ اطالوی قومی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے بانیوں اور کارگزاروں کے ناموں سے ہندستانی ناظرین واقف ہوں گے۔ ان میں سب سے زیادہ ممتازین اشخاص تھے۔ جی سپ ماتسی نی (بہ مادنی) Giuseppe -Mazzini. نے تحریک آزادی کی ذہنی خدمت کی گاری بال دی Garibaldi. اس تحریک کا سب سے بڑا سپاہی تھا اور کے وور Cauour. اس کا سب سے بڑا سیاس تھا۔ بے شمار دشواریوں کے بعد یہ تحریکِ آزادی کامیاب ہوئی۔ اطالیہ کی تحریکِ آزادی سے انگلستان کو بڑی ہمدردی تھی اور اُس زمانے میں انگلستان نے بکثرت جلاوطن اطالوی وطن پرستوں کی پناہ دی۔

لیکن اطالیہ کو اس تحریکِ آزادی واتحاد کے سلسلے میں دو اہم اور خاص صوبوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ فرانس نے شروع شروع میں اطالیہ کی کچھ مدد کی۔ اس کے معاوضے میں اطالیہ کو سیوائے اور نیس کو فرانس کے حوالے کرنا پڑا۔ کیوور کی وزارتِ عظمیٰ کے خاتمے کے بعد ایک بہت ہوشیار اور چالاک وزیراعظم فران چسکو کرسپی Francesco Crispi. نے اطالیہ کو جس نے ابھی ابھی سنبھل کے قومی زندگی میں قدم رکھا تھا، نوآبادیوں کی گھوڑ دوڑ میں لاشامل کیا۔ اطالیہ نے بحیرۂ قلزم کے افریقی ساحل کے اُس حصے پر قبضہ کرلیا جو ایری تیریا Eriteria. کہلاتا ہی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک اطالوی تجارتی کمپنی اور کرسپی کی کوششوں اور حکمتِ عملی سے اطالیہ کا

اُس حصّے پر تسلّط ہوگیا جو شمالی لینڈ کہلاتا ہے۔ لیکن یہ دونوں علاقے ویران تھے اور صحرا اور ریگزاروں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کرسپی کی تجویز یہ تھی کہ حبش (ابی سینیا) کو بھی فتح کرکے اطالوی سلطنت میں شامل کیا جائے۔ ۱۸۹۶ء میں حبش کی جنگ میں اطالویوں کو شکستِ فاش ہوئی اور کرسپی کو وزارت سے دست بردار ہونا پڑا۔ لیکن حبش کی تسخیر کی اُمنگ اطالویوں میں برابر باقی رہی۔ یہاں تک کہ مسولینی کی افواج نے ۱۹۳۵ء و ۱۹۳۶ء کی جنگ کے بعد اس ملک پر قبضہ کرلیا۔

اِدھر شمالی افریقہ پر فرانس کی بڑھتی ہوئی سلطنت دیکھ کر اطالویوں کو غصّہ بھی آرہا تھا اور خوف بھی ہو رہا تھا۔ الجزائر اور تونس کے بعد فرانسیسیوں نے مراکو کو بھی اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔

۱۸ ستمبر ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے ترکی کو ایک ایسا عجیب و غریب الٹی میٹم بھیجا جس کی نظیر حکمتِ عملی کی تاریخ میں کم ملے گی[1]۔ اِس الٹی میٹم میں اطالیہ نے مطالبہ کیا کہ "طرابلس کو ترکی نے جس بدنظمی کے عالم میں چھوڑ رکھا ہے۔ اس کے خاتمے کی ضرورت ہے"۔ قصّہ مختصر اطالیہ نے ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر حملہ کیا۔ اس حملے کے واقعات میں انور پاشا کے کارناموں، سنوسیوں کے جہاد اور ان کی بہادری اور فاطمہ بنتِ عبداللہ کے قصّے سے ہمارے ناظرین بخوبی واقف ہوں گے۔ پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے دوران میں ترک اور جرمن افسروں کی سرپرستی میں اہلِ قبایل نے اطالیہ کو طرابلس سے قریب قریب بے دخل کر دیا اور صرف چند ساحلی حصّے ۱۹۱۹ء میں اطالیہ کے قبضے میں تھے لیکن ۱۹۱۹ء میں حکومتِ اطالیہ نے ایک نئی

---

[1] P. T. Moon: Imperialism and World Politics.

حکمتِ عملی اختیار کی اور وہ یہ کہ طرابلس کے باشندوں کو اطالویوں کے برابر مُلکی حقوق عطا کیے۔ اس سے طرابلس کے عرب بڑی حد تک رام ہوگئے ساتھ ہی ساتھ نوآبادیوں کی پارلیمانوں میں طرابلس کے باشندوں کو بھی نشستیں دی گئیں۔ جاذب شہنشاہیت کا یہ تجربہ بہت کامیاب ہُوا۔

یہ تو اطالوی شہنشاہیت کے پہلے دوْر کا ذکر تھا۔

اطالوی شہنشاہیت کا دوسرا دوْر فاشسطی انقلاب کے بعد سے شروع ہوتا ہی۔ یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ابتدا سے فاشسطی پروگرام علیحدگی پسند شہنشاہیت کا حامی تھا۔ ہرہٹلر کی خود نوشت سوانح عمری "میری جدوجہد" علیحدگی پسند شہنشاہیت اور نسلی امتیاز کے نظریوں سے بھری پڑی ہی لیکن مسولینی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں نوآبادیاتی شہنشاہیت کے نظام العمل کا ذکر کرتے ہوئے نہ علیحدگی پسند شہنشاہیت کی تعریف کی ہی نہ اختلاطِ نسلی کی مخالفت کی ہی۔

فاشسطی حکومت نے طرابلس کی رہی سہی بغاوت کو بزورِ شمشیر فتح کیا۔ اور حکمتِ عملی میں یہ اصول بھی شامل رہا کہ اطالویوں کو بڑی تعداد میں آباد کیا جائے۔ پارلیمان کو مٹا کے گورنروں کو مختارِ کُل بنایا گیا[1]۔ ان سب باتوں کا ذکر کرتے ہوئے مسولینی نے اختصاراً نوآبادیوں کی حالت (سنہ ۱۹۲۸ء میں) یوں بیان کی ہی۔ "اِن علاقوں میں امن ہی۔ ترکِ وطن کرکے لوگ وہاں برابر آباد ہورہے ہیں۔ وہاں سرمایہ جارہا ہی، وہاں مزدور جارہے ہیں۔"

فاشسطی شہنشاہیت کا سب سے بڑا خواب یہ ہی کہ پھر سے رومۃ الکبریٰ کی سلطنت کو زندہ کیا جائے۔ جن حضرات نے فتحِ حبش (سنہ ۱۹۳۶ء) کے

---

[1] Benito Mussolini: My Autobiography (trans. by R. W. Child).

بعد سے روما کا سفر کیا ہے دیکھا ہوگا کہ روما میں فورم Forum. کی دیوار پر تین نقشے ہیں ایک نقشے میں صرف شہر روما اور نواح پر رومیوں کا قبضہ ہے۔ دوسرا نقشہ رومتہ الکبریٰ کے انتہائی عروج کے زمانے یعنی ٹراجن Trajan. کے عہد کا ہے اور تیسرا نقشہ موجودہ اطالوی سلطنت کا ہے جس میں حبش کی افریقی سلطنت بھی شامل ہے۔

حبش کی فتح کا جو خواب ۱۸۹۶ء میں کرسپی نے دیکھا تھا وہ ۱۹۳۵ء میں پورا ہوا اور اس کے ساتھ ہی روم اور برلن کا محور بھی قایم ہوا جس نے بالآخر ۱۹۳۹ء میں یورپ میں پھر جنگ کی آگ بھڑکا دی۔

روم برلن محور کے قایم ہونے کا اثر فاشسٹی شہنشاہیت کے اصول پر بھی پڑا۔ علیحدگی پسند شہنشاہیت کی قدر کی جانے لگی۔ یہودیوں سے تعصب شروع ہوا اور اُن کے خلاف قوانین نافذ ہوئے اور اگرچہ طرابلس کے عربوں کو ملکی حقوق ملتے رہے لیکن دوسری طرف نسلی امتیاز کے عجیب وغریب قانون بھی منظور ہوئے مثلاً اگر کسی اطالوی اور کسی غیر اطالوی محکوم باشندے کی اولاد ہو تو وہ غیر اطالوی اور محکوم سمجھی جائے گی۔

لیکن پھر بھی اطالوی فاشسطیت اور جرمنی کی اشتراکی قومیت Nazional Sozialismus. میں یہ بنیادی فرق ہے کہ فاشسطیت کی بنیاد قوم پرستی پر ہے اور " نانسی " اصول کی بنیاد نسل پرستی پر۔ ان دونوں تحریکوں کا جو ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں ایک دوسرے پر بہت اثر ہوا ہے۔ ہٹلر نے اپنی آپ بیتی میں مسولینی اور اس کے اصول کی تعریف کی ہے اور روم برلن محور کے بعد فاشسطیت نے بھی بہت سے " نانسی اصول اختیار کر لیے ہیں۔

یہ شہنشاہیتیں جن کی بنیاد زور، طاقت اور زبردستی کے فلسفے پر ہی دوسری جنگِ عظیم کی ذمہ دار ہیں۔ جرمنی نے تو جنگ کے لیے بہت سے بہانے کیے لیکن اطالیہ کا بہانہ ہی یہ تھا کہ اطالوی سلطنت کو وسعت کی ضرورت ہی۔ اِس پر پروفیسر مُون[1] کا نقل کیا ہُوا ایک قول بے اختیار یاد آجاتا ہی جس کا ترجمہ اگر اُردو میں کیا جائے تو شاید وہ لُطف باقی نہ رہے:-

" A large empire is the best of all reasons

for a large Empire. "

لیکن اب جنگ کا جو نقشہ ہی[2] اُس سے تو یہ معلوم ہوتا ہی کہ اطالوی فاشسٹی شہنشاہیت کچھ ہی دن کی محتاج ہی۔

---

[1] *P. T. Moon* : Imperialism and World Politics.

[2] یعنی ستمبر ۱۹۴۱ء میں

چھٹا باب

علیحدگی پسند شہنشاہیتیں

(۱)

یورپ کے شمالی ممالک میں سے ایک آدھ مثلاً انگلستان یا جرمنی کے کچھ حصّوں پر رومتہ الکبریٰ کی حکومت رہی لیکن رومتہ الکبریٰ کے تمدّن کے اثرات یا رومتہ الکبریٰ کی روایات اِن ملکوں میں باقی نہیں رہنے پائیں۔ انگلستان کو اینگلو سیکسن اور پھر ڈین اور وائکنگ قبیلوں نے فتح کر لیا اور رومتہ الکبریٰ کے تمدّن کے اثرات فنا ہو گئے۔

غرض اِن شمالی اقوام کے تمدّن نے جب شہنشاہیت کی تاریخ میں قدم رکھا تو رومتہ الکبریٰ کے تمدّن سے زیادہ استفادہ نہیں کیا۔ لاطینی اقوام کی شہنشاہیت کی طرح شمالی اقوام کی شہنشاہیت بھی یورپ کے صنعتی انقلاب سے متاثر تھی اور اسی پر اس کا مدار تھا لیکن لاطینی اقوام کی طرح اِن شمالی اقوام (انگریز، ولندیز، جرمن اقوام) نے تجارتی شہنشاہیت اور رومتہ الکبریٰ کی روایات کو ملانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ شروع ہی سے کبھی اِن سلطنتوں کا رجحان جاذب شہنشاہیت کی طرف نہیں ہونے پایا اور انھوں نے نسلی امتیاز پر علیحدگی پسند شہنشاہیتوں کی بنیاد رکھی اور اِسی کو اپنے تجارتی اور اپنے ملک کے صنعتی مفاد کے لیے ضروری اور ناگزیر تصور کیا۔ علیحدگی پسند شہنشاہیت ہی کو انھوں نے آبادی کے غیر ضروری اضافے کا

علاج بھی سمجھا۔

اِن دو قسم کی شہنشاہیتوں یعنی شمالی شہنشاہیت (علیحدگی پسند) اور لاطینی شہنشاہیت (جاذب) کا فرق ایک محکوم قوم کے مورّخ کی زبانی سنیے[1]:

"لاطینی قوموں کو رنگ والی نسلوں سے اتنا تعصب نہیں .... فرانسیسیوں کے لیے اہلِ تونس، الجزائری، بربر، مراکشی، ہندوا ور ہند چینی کسی طرح سفید نسل کے لوگوں سے کم نہیں سمجھے جاتے۔"

اگرچہ اس بیان میں مبالغے کا جزو ضرورت سے ذرا زیادہ ہی پھر بھی یہ حقیقت ناقابل انکار ہی کہ شمال کی علیحدگی پسند سلطنتیں نسلی اختلاط کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتیں، اسی لیے معاشری طور پر بھی اُن محکوم اقوام سے جو غیر یورپی ہیں زیادہ میل جول نہیں رکھتیں اور انھیں ایک حد تک کم تر بھی سمجھا جاتا ہی۔ طرح طرح کے "نسلی" نظریوں کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہی کہ پروپاگنڈا کر کے حاکم اور محکوم قوموں کے درمیان ایک حدِّ فاصل قایم کر دی جائے جو محض سیاسی اور معاشی ہی نہیں بلکہ معاشری اور نسلی بھی ہو۔

(۲)

برطانوی شہنشاہیت کی ایک نہیں کئی قسمیں ہیں۔ موجودہ سلطنتِ برطانیہ کے مختلف حصّوں کے لوگ باعتبار تمدّن، زبان، رنگ ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ کوئی دو حصّے اس سلطنت میں ایسے نہیں جن کی حکومت یکساں ہو[2]۔ اس سلطنت میں برطانوی شہنشاہیت کہیں علیحدگی پسند ہی اور کہیں جاذب۔

---

[1] V. Shiva Ram: Comparative Colonial Policy.

[2] W. B. munro: The Govern ment of Europe.

تاریخی نقطۂ نظر سے بھی سلطنتِ برطانیہ کی روش بعض حصّوں میں علیحدگی پسندی کی طرف مائل رہی اور بعض حصّوں میں جاذب شہنشاہیت کی طرف۔ چنانچہ اسکاچستان اور ویلز میں شروع ہی سے انگلستان کے بادشاہوں نے جاذب شہنشاہیت کے اصول کو برتا۔ ان میں اسکاچستان (خصوصاً جنوبی حصہ) تمدّن اور زبان میں انگریزوں سے بہت قریب تھا۔ اس لیے جب ملکۂ الزبتھ کے بعد انگلستان کا تاج اسکاٹ بادشاہ جیمز اسٹوارٹ کو ملا تو بہت جلد دونوں ممالک کے باشندے گھُل مِل کر ایک ہونے لگے اور اس کے بعد جب برطانوی سلطنت کے عروج اور اقبال کا زمانہ آیا تو اہل اسکاچستان نے سلطنت کی خدمت اسی طرح کی جیسے انگریزوں نے۔

ویلز کی زبان علیحدہ ہے اور کیلٹی خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے، یہاں کے لوگ تمدن میں بھی انگریزوں سے ذرا مختلف ہیں، لیکن شروع ہی سے ویلز میں جاذب شہنشاہیت کے اصول پر عمل کیا گیا۔ انگلستان کا ولیعہد "شہزادۂ ویلز" کہلاتا ہے۔ شیکسپیر کے ڈرامے "ہنری پنجم" میں کپتان فلولین کا کردار انگلستان اور ویلز کے اتحاد اور یگانگت کو ظاہر کرتا ہے۔

آئرستان کا مسئلہ کسی قدر مختلف تھا۔ پہلے تو یہ کہ آئرستان ایک زمانے میں ایک بہت بڑے تمدن کا مرکز رہ چکا ہے۔ اُس زمانے میں جب کہ شمالی یورپ جہالت اور بربریت کے عالم میں تھا۔ آئرستان نے عیسائیت کی تبلیغ کی اور انسانیت کا سبق دیا۔ آئرستان کا ادب بھی بہت قدیم ہے اور اُس ادب کے علاوہ جو آئرستان کی اپنی زبان Erse. میں ہے انگریزی میں بھی آئرستانی ادیبوں کے دم سے بڑی رونق رہی۔ انگریزی کے جدید ادیبوں میں سے برنرڈشا اور ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس آئرستانی ہیں۔ اس قدیم

تمدن اور ادب پر خود اہل آئرستان کو بڑا ناز رہا اور وہ انگلستان کی حکومت تو ایک طرف اپنے آپ کو برطانوی سمجھنے تک پر راضی نہیں تھے۔ اِس کے علاوہ انگلستان اور آئرستان کے درمیان ایک اور خلیج حایل تھی یعنی مذہب، آئرستان کے بشیتر حصّے کا مذہب رومن کیتھولک ہے اور انھوں نے "کلیسائے انگلستان" کے مذہب کو کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ انگلستان کی تاریخ اور انگلستان کا ادب، انگلستان اور آئرستان کے تعلقات کی کشیدگی سے بھرا ہوا ہے اِس لیے آئرستان میں انگلستان کی جاذب شہنشاہیت صرف شمالی صوبوں میں پھیل گئی۔ ورنہ آئرستان میں بغاوت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ آئرستان کے نمایندے برطانوی پارلیمان میں شامل ہوئے تب بھی ان کی انتہائی خواہش یہی رہی کہ آئرستان کو ہوم رؤل ملے۔ یہاں تک کہ جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۱۸ء میں آئرستان کو ڈومینین کا مرتبہ دیا گیا۔ اس کے بعد سے دونوں ممالک کے درمیان جو خلیج حایل تھی وہ وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ دوسری جنگِ عظیم میں آئرستان نے ابھی تک حکومت برطانیہ کا ساتھ نہیں دیا اور ابھی تک ڈی ویلرا کی حکومت جنگ میں غیر جانبدار رہی۔

امریکہ کی دریافت کے بعد جب انگلستان کی امریکی نوآبادیوں پر شہنشاہیت کا سوال درپیش تھا تو حکومت برطانیہ نے خود ان برطانوی النسل مہاجرین پر علیحدگی پسند شہنشاہیت کے اصول کو آزمانا چاہا۔ اِس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ امریکی جنگِ آزادی میں شمالی امریکہ کے زرخیز صوبے ان کے ہاتھ سے نکل گئے اور یہی ریاستہائے متحدہ امریکہ بنے۔ اس کے بعد سے برطانوی سلطنت کو اس کا سبق مل گیا کہ برطانوی النسل باشندوں کی نوآبادیوں کو انگلستان کے برابر حقوق دیے جائیں اور آئین ویسٹ منسٹر کی بموجب کناڈا،

آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ کی مکمل فتح کے بعد جنوبی افریقہ کو بھی ڈومینین کا مرتبہ دیا گیا۔ اِن سب ممالک کو اندرونی اور بیرونی حکمتِ عملی کے اعتبار سے حکومتِ خود اختیاری حاصل ہے۔ یہ تمام ممالک پوری طرح آزاد ہیں اور برطانوی سلطنت کے دایرے میں اس حد تک شامل ہیں کہ برطانوی شہنشاہ ان کا بھی شہنشاہ ہے اور باعتبارِ نسل ان ملک کے برسرِاقتدار باشندے برطانوی ہیں۔

لیکن اِن علاقوں میں جنھیں ڈومینین کا مرتبہ حاصل ہے محض برطانوی نسل کے لوگ ہی نہیں بستے۔ آسٹریلیا میں حبشی نما وحشی بستے ہیں جو بُش مین کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ بنی نوعِ انسان کا اسفل ترین نمونہ ہیں اور غالباً اِن میں نسلی اختلاط بھی کافی ہوا ہے۔ تعداد میں بھی یہ زیادہ نہیں۔ اِس طرح حکومت میں ان کا کوئی حصّہ ہونا ممکن بھی نہ تھا۔

نیوزی لینڈ کے اصلی باشندے ماوری کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ ہلکے گندمی رنگ کے ہوتے ہیں جیسے جنوبی اطالیہ کے باشندے اور باعتبارِ تمدّن اِن لوگوں نے اچھی خاصی ترقی پہلے ہی کرلی تھی۔ نیوزی لینڈ کی حکومت میں ماوری طبقے کی اچھی خاصی نمایندگی ہے اور کسی برطانوی ڈومینین میں اصلی باشندوں سے اتنا اچھا سلوک نہیں کیا جاتا جتنا نیوزی لینڈ میں۔

کناڈا میں اصلی باشندوں کا سوال برائے نام ہے۔ امریکی "سرخ" اصلی باشندے بہت تھوڑے ہیں اور تمدّن میں بہت پیچھے ہیں۔ فرانسیسی نسل کے آبادکاروں سے مساوات کا سلوک کیا جاتا ہے۔

اصلی باشندوں کا سوال سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے تو جنوبی افریقہ میں جہاں یورپی نسل کے باشندے برتر اور حاکم، اور افریقہ کے بینگرو یا

ہندستانی مہاجرین "رنگ والے" اور محکوم سمجھے جاتے ہیں۔ معاشی اور سیاسی وجوہ کے باعث غیر یورپی باشندوں کو یورپی باشندوں سے بالکل الگ رکھا جاتا ہے کہ نسلی اختلاط کا خفیف ترین امکان باقی نہ رہے۔ واضح ہو کہ جنوبی افریقہ کی سفید آبادی میں ولندیزی عُنصر برطانوی عُنصر سے زیادہ ہے۔ جنوبی افریقہ کی حکومت میں بھی ولندیزی عناصر ہی زیادہ حاوی ہیں۔ اور پُرانی ولندیزی جمہوریتوں کا (جن کو انگریزوں نے فتح کیا) یہ قانونی اصول تھا: "مذہب ہو یا ریاست کسی میں گورے اور کالے کی برابری نہیں"[۱] یہ اصول ایک امریکی مصنف[۲] کے خیال میں معاشی سے زیادہ معاشری نظریوں پر مبنی ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے حکومت سفید رنگ نسل کے غریب طبقے کو "رنگ والی" قوم کے مزدوروں کے مقابلے سے بچانا چاہتی ہے تو دوسری طرف معاشی نقطۂ نظر سے وہ نسلی اختلاط کی انتہائی مخالف ہے۔ جنوبی افریقہ کو ڈومینین کا درجہ ملنے سے قبل جو ولندیزی جمہوریتیں وہاں قایم تھیں اُن میں حبشی باشندوں کو زراعت کے لیے غلاموں کی طرح برتا جاتا تھا، لندن کی حکومت نے فتح کے بعد اِن سیاہ فام باشندوں کی حمایت کی۔ لیکن ڈومینین کا درجہ ملنے کے بعد پھر ولندیزی عناصر نے زور باندھا تو اُنھوں نے پھر سے حبشیوں کی نسلی "کمتری" کی رٹ لگائی چنانچہ اب جنوبی افریقہ کی ڈیڑھ ملین سفید فام آبادی کے تصرف میں دو سو تئیس ملین ایکڑ زمین ہے[عہ] اور ساڑھے پانچ ملین بنگرو اصلی باشندوں کے لیے صرف ستائیس ملین ایکڑ[عہ]۔ مزید برآں ۱۹۱۳ء میں جنرل بوتھا کے قانونِ اراضی کے ذریعے سیاہ فام بنگرو باشندوں کو اس حق

---

۱ و ۲ W. Y. Elliot: The New British Empire.

۳ P. T. Moon: Imperialism and World Politics.

عہ ۱۴۶ ایکڑ فی کس — عہ ۵ ایکڑ فی کس

سے محروم کر دیا گیا کہ وہ اس رقبے میں زمین خرید سکیں جو سفید فام لوگوں کے تصرّف کے لیے مخصوص کر دی گئی ہی۔[۱] اسی طرح کانوں میں جو حبشی کام کرتے ہیں اُنھیں سالانہ نبیس پونڈ اُجرت ملتی ہی[ع] لیکن جو سفید فام مزدور کام کرتے ہیں اُنھیں چار سو اٹھتّر (۴۷۸) پونڈ اُجرت ملتی ہی[ع]۔ جنوبی افریقہ کی سلطنت کا پورا نظام نسل کی بنیاد پر علیحدگی پسند شہنشاہیت ہی۔

نسلی اعتبار سے اور شہنشاہیت کے نقطۂ نظر سے جنوبی افریقہ میں ایک اور بہت پیچیدہ مسئلہ ہی اور یہ وہاں کی ہندستانی آبادی کا مسئلہ ہی۔ شروع میں وہاں کان کنی کے لیے ہندستانی مزدور بلائے گئے، پھر وہاں تجارت پیشہ ہندستانی بھی کافی تعداد میں پہنچے۔ حبشیوں سے جو بہت غیر متمدّن ہیں، سفید فام حاکم طبقے کو زیادہ اندیشہ نہیں مگر ہندستانیوں سے انھیں بہت خوف ہی۔ ایک تو یہ کہ تجارت اور ہر دوسرے میدان میں ہندستانی مساوی طور پر سفید فام باشندوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں دوسرے یہ کہ سفید فام حکمران طبقے کے خلاف یہ ایک محاذ بنا کر حبشیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا سکتے ہیں۔ معاشری اعتبار سے حبشی اور ہندستانی تقریباً ایک ہی صف میں رکھے گئے ہیں اور دونوں کو سفید فام طبقے سے بہت دور رکھا گیا ہی تاکہ معاشری میل جول یا نسلی اختلاط نہ ہونے پائے۔ اس بدسلوکی کا نتیجہ یہ ہی کہ متعدد موقعوں پر حکومتِ ہند اور جنوبی افریقہ کی حکومت میں باہمی مخالفت ہوئی۔[۲] جنوبی افریقہ کے تمام سیاسی گروہ اس حد تک متفق الرائے ہیں کہ مزید ہندستانیوں کو جنوبی افریقہ میں بسنے کی

---

[۱] P. T. Moon: Imperialism and World Politics.

[۲] W. Y. Eleiot: The New British Empire.

[ع] ۲½ پونڈ ماہوار یا ایک روپیہ ڈیڑھ آنہ یومیہ [ع] ۴۰ پونڈ ماہوار یا ستّرہ روپیہ ۵ آنہ یومیہ

اجازت نہ دی جائے اور جو ہندستانی وہاں آباد ہیں انھیں اپنے وطن واپس جانے کی ترغیب دی جائے۔ ۱۹۲۳ء کی امپیریل کانفرنس میں جنرل اسمٹس نے کانفرنس کی اس تجویز کی مخالفت کی کہ سلطنتِ برطانیہ کے تمام حصّوں میں تمام برطانوی رعایا کے ساتھ یکساں سلوک ہو۔ جنرل اسمٹس نے اس امر پر زور دیا کہ چونکہ یہ تجویز بلا مخالفت منظور نہیں ہوئی اس لیے اس کی کوئی دستوری اہمیت نہیں[1]۔ سر تیج بہادر سپرو نے جو اس کانفرنس میں حکومتِ ہند کے نمایندے تھے جنرل اسمٹس کے اس طرزِ عمل کی مخالفت میں یہاں تک کہا کہ ہندستان کو مجبور ہو کے جنیوا میں جمعیۃ الاقوام کے سامنے اس طرزِ عمل کی شکایت کرنی ہوگی جو ہندستانیوں سے جنوبی افریقہ میں کیا جاتا ہے[2]۔ اس دھمکی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ جنوبی افریقہ میں ہندستانیوں سے جو بدسلوکی کی جاتی ہے اسی سے متاثر ہو کر مہاتما گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک پہلے وہاں شروع کی تھی (اگرچہ پھر خود ہی اسے موقوف کر دیا اور حکومت سے صلح کر لی) مسٹر سری نواس شاستری کی کوششوں سے ۱۹۲۷ء میں ایک "شریفانہ مفاہمت" اس قسم کی ہوئی کہ جنوبی افریقہ میں کوئی ایسا قانون پاس نہ کیا جائے گا جس کا اثر ہندستانیوں کی معاشی مساوات پر پڑے۔

ہندستانیوں اور یورپی نسل کے برطانوی باشندوں کے مابین نسلی امتیاز اگرچہ جنوبی افریقہ میں بہت زیادہ تھا دوسرے ڈومینین بھی اس سے قطعاً معرّا نہیں تھے۔ چنانچہ سری نواس شاستری نے ان ممالک کا بھی دورہ کیا۔ بجز طالب علموں، سیاحوں اور تجارتی نمایندوں کے، ہندستانی کناڈا یا نیوزی لینڈ یا آسٹریلیا میں آباد نہیں ہو سکتے۔ کناڈا کے ایک صوبے برٹش کولمبیا

[1] و [2] *W. Y. Elliot*: The New British Empire.

کے ہندستانی باشندوں کو حقِ رائے دہی سے محروم رکھا گیا ہے۔[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ اِن ملکوں میں برطانوی (یا زیادہ سے زیادہ یورپی) نسل کی سفید فام آبادی معاشی اعتبار سے بڑے مزے میں ہے اور یہ نہیں چاہتی کہ بھوکے، فاقہ مست ہندستانی اِن ممالک میں آباد ہو جائیں۔ اس سے ملک کی خوشحالی پر اثر پڑے گا اور اپنے معیارِ زندگی کی وجہ سے سفید فام مزدور طبقہ تو بالکل تباہ ہو جائے گا۔ اُن ممالک کی معاشی ضروریات کی وجہ سے نسلی امتیاز مفید ترین طریقۂ امتیاز ہے۔

ہندستان کی آبادی بڑھتی ہی جا رہی ہے اور اس کی ضرورت ہے کہ ملک کے باہر وہ نئی سرزمین تلاش کرے۔ سفید نوآبادیاں ایشیائیوں کی ہجرت کو پسند نہیں کرتیں۔ کسی ڈومینین کے نمایندے وزیر نے اس پر بھی رضامندی نہیں ظاہر کی کہ کینیا کو ہندستان کی زاید آبادی کے لیے ایک نوآبادی بنایا جائے[2] جنوبی افریقہ، کناڈا اور آسٹریلیا کے اس نسلی امتیاز پر ہندستانیوں کو غصّہ آتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندستان کو ان ممالک کی طرح ڈومینین کا درجہ دیا جائے تو وہ اس نسلی امتیاز اور اس ذلّت کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکے گا اور سلطنتِ برطانیہ کا وفادار کیوں رہے گا۔[3]

یہ تو اُن ممالک کے نسلی امتیاز کا تذکرہ تھا جن کو ڈومینین کا مرتبہ حاصل ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خود انگلستان کا رُجحان بحیثیت مجموعی نسلی امتیاز پر ہے اور اسی پر برطانوی علیحدگی پسند شہنشاہیت کا مدار ہے لیکن جہاں انگلستان میں ایک طرف نسلی امتیاز کا رُجحان ہے

---

[1] *W. Y. Elliot* : The New British Empire.

[2] و [3] *P. T. Moon* : Imperialism and World Politics.

دوسری طرف اس کا ردِ عمل بھی ہے۔ انگلستان ہی نے کپلنگ کے توڑ پر ای۔ ایم۔ فارسٹر اور آلڈس ہکسلے کو بھی پیدا کیا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ انگلستان کی امیر جماعت جو عرصے تک برسرِ حکومت رہی نسلی امتیاز کی بھی حامی رہی۔ اِس امیر جماعت کی خصوصیت کو پروفیسر لاسکی Lasky. نے بڑی خوبی سے ایک مضمون میں بیان کیا ہے[1]۔ انگریزی لفظ "جنٹل مین" ایک خاص معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جن کو انگریز ہی خوب سمجھتے ہیں۔

"صنعتی انقلاب کے ایک صدی بعد تک انگلستان کی باگ ڈور تاجروں کے ہاتھ میں رہی، اِس عرصے میں جنٹل مین نے اپنے آپ کو تمدن کا وارث بنالیا لیکن انگلستان میں کسی نے سنجیدگی سے یہ سوال نہیں اُٹھایا کہ کہ اُسے حکومت کرنے کا کیا حق ہے[2]۔"

جنٹل مین کی خصوصیات یہ ہیں:۔

" یہ ضروری ہے کہ وہ کسی کلب کا ممبر ہو، لازمی ہے کہ وہ کنسرویٹو پارٹی کا رُکن ہو، اور اگر اس کے خیالات وہی ہوں جو اخبار مارننگ پوسٹ کے ہوتے ہیں، تو اور بھی اچھا ہے .... اُس کے پسندیدہ مصنفین سرٹس اور کپلنگ ہوں .... ہندستانیوں، اشتراکیوں، ٹریڈیونین والوں اور چوروں سے قطعِ نظر وہ بالعموم متعصب نہیں ہوتا ....[3]"

طبقۂ اُمرا کی اِن خصوصیات کا اثر عام طبقوں پر بھی پڑا ہے اور پروفیسر لاسکی نے اس کی تاویل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اہلِ انگلستان کی

---

[1] و [2] و [3] Harold J. Laski : The Danger of Being a Gentleman.

نخوت دراصل ایک مجموعی احساس کمتری Inferiority Complex. ہی۔[۱]
لیکن انگلستان میں اِس طبقے کا ردِّ عمل کرنے والا طبقہ بھی موجود ہی،
جو ہمیشہ انسانیت اور مساوات اور ترقی پسندی کا حامی رہا ہی۔ انگلستان
کے بڑے بڑے فلسفی اور زیادہ تر ادیب اِسی دوسرے طبقے سے ہیں انگلستان
کی مزدُور جماعت اس طبقے کے نقطۂ نظر کو ایک حدتک ظاہر کرتی ہی۔ اِس
سے پہلے بھی یہ نقطۂ نظر ہمیشہ انگریزی قوم کی خصوصیت رہا۔ انگلستان
نے اگر ایک طرف وارن ہیسٹنگز کو پیدا کیا تو دوسری طرف فرانسس فاکس اور
برک کو بھی پیدا کیا۔ کہا جاتا ہی کہ بے خیالی کے عالم میں برطانوی سلطنت
بڑھی، لیکن بعض مؤرخوں کا خیال ہی کہ بے خیالی نہیں بلکہ گلیڈسٹون
کی بے طاقتی کے عالم میں برطانوی سلطنت بڑھی۔[۲] جون ۱۸۷۲ء میں
اپنی مشہور و معروف تقریر میں ڈزرائیلی نے کنسرویٹو پارٹی کا
ایک خاص مقصد شہنشاہیت کے فروغ کو قرار دیا۔ چھ سال تک
ڈزرائیلی کی حکومت نے اِس حکمتِ عملی پر عمل کیا۔ اس اثنا میں
فجی جزائر پر برطانیہ کا قبضہ ہوُا۔ نہر سویز کے حصص خرید لیے گئے، بلوچستان
کا الحاق کیا گیا، ٹرانسوال کا الحاق کیا گیا۔ کریمیا میں ترُکی کو مدد دی گئی
اور معاوضے میں جزیرۂ قبرس ملا۔ ۱۸۷۹ء کی جنگ افغانستان نے
ڈزرائیلی کی وزارت پر اثر ڈالا اور گلیڈسٹون کو پھر وزارتِ عظمیٰ کا
موقع ملا لیکن اس چھ سال کے عرصے میں ڈزرائیلی کنسرویٹو پارٹی
کی علیحدگی پسند شہنشاہیت کی بنیاد رکھ چکا تھا۔ تاریخ کی ستم ظریفی دیکھیے

---

[۱] *Harold J. Laski* : The Danger of Being a Gentleman.

[۲] ***P. T. Moon*** **: Imperialism and World Politics.**

کہ اِن بدلے ہوئے حالات میں خود گلیڈسٹون کو ڈزرائیلی کی حکمتِ عملی پر عمل کرنا پڑا۔ کیونکہ اکثریت یہی چاہتی تھی۔ معاشیات اور سرمایے کے ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈزرائیلی نے رکھ دی تھی کہ اس کے اثر سے اور انگریز سرمایہ داروں کے اثر سے خود گلیڈسٹون کو مجبور ہو کے مصر پر فوجی اقتدار جمانا پڑا[1]۔ اس کے بعد سے برطانوی سلطنت کے انتہائی عروج واقتدار کا زمانہ شروع ہوتا ہے جس کا سب سے بڑا شاعر کپلنگ تھا۔

(۳)

ہالینڈ ایک چھوٹا سا ملک ہے، لیکن اس کی سلطنت خاصی بڑی ہے اور دولت مندی کے اعتبار سے یہ ملک یورپ کے ممالک کی صفِ اوّلین میں ہے۔ ہالینڈ کی نوآبادیوں میں یوں تو جنوبی امریکہ کا ذرا سا حصّہ بھی شامل ہے لیکن خصوصیت سے قابلِ ذکر جزایر شرق الہند کی ولندیزی نوآبادیاں ہیں جن میں سماٹرا اور جاوا کے جزایر شامل ہیں جو موتیوں کی تجارت اور خوشبودار مسالوں کے لیے صدیوں سے مشہور ہیں۔

ایک زمانے میں جب ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی تو دیسی سرداروں سے صرف مسالوں کی صورت میں خراج لیا جاتا تھا اور کمپنی کو اِن جزایر کے نظم ونسق سے کوئی سروکار نہ تھا لیکن جب مسالوں کی تجارت میں کمی ہوئی تو اِن ملکوں میں شکر، قہوہ، کافی، تمباکو وغیرہ کی کاشت کی جانے لگی۔ اس لیے ضروری تھا کہ بڑے بڑے مزرعے قایم کیے جائیں، سڑکیں بنائی جائیں، چنانچہ اس دَور میں ولندیزی حکومت نے جزایر کے دیسی باشندوں سے جانوروں کی طرح کام لینا شروع کیا ایک گورنر

---

[1] P. T. Moon : Imperialism and World Politics.

ڈینڈلس Daendels. نامی نے ایک خاص ضلع میں یہ حکم نافذ کیا کہ ہر گانو کے لوگ فی خاندان ہزار درخت کے حساب سے کافی کی کاشت کریں جن کی پیداوار سے تقریباً ایک تہائی حصّہ حکومت کو بطور محصول دیا جائے۔ بقیہ دو تہائی کے متعلّق حکم تھا کہ وہ حکومت کہ مقرّر کردہ نرخ کے بموجب فروخت کر دیں۔ اِسی گورنر نے بہت سی سڑکیں بھی بنوائیں لیکن اس طرح کہ ہر گانو کے لوگ جبراً اپنے گانو کے قریب کے حصّے کی سڑک بناتے تھے اور اگر کسی گانو کے لوگ اِس بیگار سے انکار کرتے تو اس گانو کے دسیمکھ کو پھانسی دے دی جاتی تھی[1]۔

۱۸۳۰ء میں اِس علیحدگی پسند ولندیزی شہنشاہیت نے جبر و استبداد کا ایک نیا باب کھولا جو تاریخ میں "زرعی نظام" Culture System. کہلاتا ہے۔ جاوا میں اس قانون کو کاونٹ فان ڈن بوش Count Van den Bosch. نے جاری کیا۔ اس کی رُو سے دیسیوں کی زمین میں سے پانچواں حصّہ گورنمنٹ کے واسطے کاشت کرنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ اس سرکاری زمین پر بیگار میں پڑے ہوئے دیسی کاشتکار کام کرنے پر مجبور کیے جاتے اور ہر دیسی آدمی کے لیے اپنے وقت کا پانچواں حصّہ اس سرکاری کاشت کے سلسلے میں بلا تنخواہ صرف کرنا ضروری تھا[2]۔ بعض ضلعوں میں تو دیسی باشندوں کو اتنی زمین بھی نہیں ملتی تھی کہ وہ چاول کی کاشت کر سکیں اور پیٹ بھر کے کھا سکیں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ برابر قحط سالی کا

---

[1] *P. T. Moon*: Imperialism and World Politics.

[2] *V. Shiva Ram*: Comparative Colonial Policy.

سلسلہ جاری رہتا تھا۔[۱]

۱۸۶۰ء میں ایک ولندیزی مصنّف اوو ار ددیکر Edouard Dekker. نے اس ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ہالینڈ کے روشن خیال طبقے نے بھی اِن مظالم کی مخالفت شروع کی جو جاوا میں دیسی باشندوں پر کیے جاتے تھے۔ پھر بھی اٹھارہ سال بعد یعنی ۱۸۷۸ء میں اس طریقِ کاشت یعنی Culture System. کا مکمل انسداد ہو سکا۔

لیکن اس کی جگہ ایک اور قانون نے لے لی جس نے بیگار کے قاعدے اور جبری مزدوری کو اسی طرح جاری رکھا وہ اس طرح کہ باشندوں پر ایک طرح کا محصول عاید کیا گیا جس کو ادا کرنے کے لیے انھیں مجبوراً کام کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں امیر ولندیزی کاشتکاروں کا اثر بہت بڑھ گیا اور یہ ان کے ہاتھ کی بات تھی کہ جس دیسی کو چاہیں کسی دیہات کا دسیکھ بنائیں۔ جبری مزدوری کا سلسلہ بدستور باقی رہا۔

۱۹۰۳ء سے ہالینڈ میں اصلاحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن اس میں بھی علیحدگی پسندی کی اہمیت کو ملحوظ رکھا گیا۔ جزایر فلی پاین میں ریاستہائے متحدہ نے اصلی باشندوں کو امریکی طرز کی تعلیم دی لیکن ولندیزیوں میں یہ خواہش مطلق نہیں کہ اہلِ جاوا یا اہلِ سماٹرا ان کی سی تعلیم حاصل کریں یا اُن کا تمدن اختیار کریں۔ اِس طرزِ تعلیم میں فایدے بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ فایدہ یہ کہ اِن جزایر کے باشندے مغربی تمدن اور فنون سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں مگر نقصان یہ ہے کہ ان کو علومِ عمرانی یا تاریخ یا سائنس کی تعلیم نہیں دی جاتی۔

---

[۱] *P. T. Moon*: Imperialism and World Politics.

۱۹۱۷ء میں ایک طرح کی اسمبلی اِن جزایر کے لیے قایم کی گئی جو Volksraad. کہلاتی ہی، لیکن اسے جمہوریت یا عمومیت کے حقیقی اصول سے کوئی واسطہ نہیں۔ اِس اسمبلی کے نصف ارکان کو گورنر جنرل نامزد کرتا ہی نصف کو مقامی ادارے منتخب کرتے ہیں۔ اِن منتخب کردہ ارکان میں مقامی ولندیزی باشندے، عرب اور چینی باشندے جو جاوا میں آباد ہیں اور دیسی باشندے سب ہی کے نمایندے شامل ہوتے ہیں۔

(۴)

امریکہ کی نسلی علیحدگی پسندی مقبوضات میں اتنی زیادہ نمایاں نہیں معلوم ہوتی جتنی خود امریکہ میں ریاستہائے متحدہ میں حبشیوں کے ساتھ اب بھی کامل مساوات کا سلوک نہیں کیا جاتا۔ ان کی یونیورسٹیاں تک علیحدہ ہیں اور اگرچہ امریکہ کے اُس بے مثل پریسیڈنٹ ابراہام لنکن Abraham Lincoln. نے امریکی خانہ جنگی کے ذریعے غلامی کا مکمل انسداد کر دیا لیکن امریکہ کے بہت سے حصّوں میں حبشی باعتبارِ نسل "کم تر" سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس قلیل عرصے میں اُنھوں نے موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ کی اتنی خدمت کی ہی کہ وہ کسی طرح کمتر سمجھے جانے کے مستحق نہیں۔

حبشیوں کے علاوہ امریکہ میں اصلی باشندوں سے بھی اچھا سلوک نہیں۔ اُن کے لیے بعض خطّے الگ کر دیے گئے مگر ان کو آبادی میں ملانے اور جذب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

امریکہ میں صرف ایسے مہاجرین قبول کیے جاتے ہیں جو یورپی اور خصوصیت سے شمالی یورپ کے ہوں۔ حال حال میں یہودی سرمایہ داروں کے اثرات سے کثیر تعداد میں یورپ کے ستم زدہ یہودیوں کو بھی امریکہ میں پناہ دی گئی ہی۔

لیکن ایشیائیوں کو امریکہ میں آباد ہونے کی اجازت نہیں۔ اس طرح ریاستہائے متحدہ میں جمہوریت بھی ہے اور عمومیت بھی اور مساوات بھی لیکن یہ سب سفید رنگ یورپی لوگوں کے لیے ہے۔

امریکی مقبوضات میں لے دے کے قابلِ ذکر صرف جزایر فلی پاین ہیں جو اسپین سے لڑنے کے بعد امریکہ کے قبضے میں آئے۔ یہ جزایر نوآبادی بننے کے لیے ناموزوں ہیں۔ جزایر فلی پاین میں امریکہ کا سلوک دیسی باشندوں کے ساتھ بہت اچھا ہے۔ دیسی باشندے کچھ مسلمان ہیں، کچھ عیسائی جو ہسپانوی نزاد ہیں۔ اِن جزایر میں دیسی باشندوں کو اعلیٰ درجے کی مغربی تعلیم دی جاتی ہے اور اگر جاپان کا خطرہ نہ ہوتا تو ان کو اب تک آزادی بھی مل چکی ہوتی۔

امریکی سیاسیات کی مشین کچھ اس طرح کی ہے کہ اس میں غیرنسلوں پر حکومت کرنے کا کوئی جُداگانہ ڈھب نہیں۔ اُن پر علیحدگی پسندی سے حکومت کرنا امریکی سیاسی اصول کے خلاف ہے اِس لیے اِن مقبوضات میں بھی اسی طرح حکومت ہوتی ہے جیسے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اور حکومت میں محکوم طبقوں کی رائے برابر شامل رہتی ہے۔[1]

یہاں یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ ریاستہائے متحدہ شروع سے مقبوضات حاصل کرنے کی حکمت عملی سے بے تعلق ہیں۔ چنانچہ جب امریکہ ہی کے بھیجے ہوئے حبشیوں نے مغربی افریقہ کے ساحل پر لائی بیریا کی حبشی ریاست قایم کی تو امریکہ نے "پدرانہ شفقت" کا دعویٰ کر کے اس ریاست کو یورپ کی حکومتوں سے بچایا لیکن کبھی اس ریاست کے نگہبان یا مالک

---

[1] V. Shiva Ram : Comparative Colonial Policy

ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن ہسپانیہ اور امریکہ کی جنگ کے بعد امریکہ نے مقبوضات حاصل کرنے شروع کیے۔ یہ بھی ایسے تھے جن سے امریکہ کی مدافعت میں مدد ملتی ہے (باستثنائے فلی پاین) یہ حکمتِ عملی اسی طرح کی تھی جیسے اشتراکی روس کی حکمتِ عملی دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں امریکہ نے ہوائی پر قبضہ کیا اور اسی سال پورتوری کو اور فلی پاین بھی امریکہ کے قبضے میں آ گئے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں اس نے کیوبا Cuba. پر قبضہ کر لیا اور آج کیوبا کی ریاست امریکہ کی نگہبانی میں ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ خود امریکہ میں نسلی اختلاط کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ صرف حبشی ہی نہیں بلکہ امریکہ کے اصلی باشندے اور حبشی مہاجرین بھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے۔ مختلف نسلوں کے مابین شادی بیاہ کو مذموم سمجھا جاتا ہے۔ "نسلی نظریے" جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں، امریکہ میں بہت مقبول ہیں اور نسلی امتیاز کا معیار رنگ ہے۔ رنگ کی بنیاد پر نسلی اختلاط کو روکنے کے لیے ایک فصیل سی قایم کی گئی ہے جو Colour Bar. کہلاتی ہے۔

لیکن مقبوضات میں اہل امریکہ دیسیوں سے انتہائی شرافت اور ایک حد تک مساوات کا سلوک کرتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ قابلِ تحسین ہیں۔

(۵)

سنہ ۹۸ء میں مشہور لاطینی مورخ ٹے سی ٹس Tacitus. نے اپنی کتاب "جرمانیا" لکھی۔ یہ اُن وحشی قبایل کا حال تھا جو رومتہ الکبریٰ کی سلطنت کی حدود کے باہر زور پکڑ رہے تھے اور جنھوں نے آخر اس سلطنت کا نقشہ اُلٹ دیا اور اس کے تمدّن کو درہم برہم کر دیا۔ اس

نے ان لوگوں کی سادگی اور پاکیزگی کی ضرورت سے کچھ زیادہ تعریف اس لیے کی کہ وہ اہلِ روما کی رنگینی اور عشرت پسندی کی درپردہ مذمّت کرنا چاہتا تھا۔ بالکل اسی طرح روسو اور اُس کے ہم عصروں نے امریکہ کے اصلی باشندوں اور دنیا کے غیر متمدّن حصّوں کے وحشی باشندوں کو بلحاظ اخلاق وعادات اہلِ یورپ سے برتر دکھانے کی کوشش کی تھی۔ کچھ اس قسم کی کوشش اس زمانے میں ٹے سی ٹس نے بھی کی تھی لیکن آج جرمنوں کے نسلی فخر ومباہات کی ابتدا اس کی کتاب کے حوالوں سے ہوتی ہے۔ جدید سائنٹفک نقطۂ نظر سے ٹے سی ٹس کے بیان کو زیادہ قابلِ اعتبار نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کی جغرافیائی معلومات مبہم تھیں یا جن لوگوں کا اُس نے ذکر کیا ہے وہ کسی طرح بھی موجودہ جرمنوں کے آبا واجداد نہیں بلکہ ان کے پیشرو تھے[1]۔ بہرحال اُس نے اِن قدیم "جرمنوں" کے متعلق یہ فقرے قلمبند کیے۔

"جرمنی کے لوگ میرے خیال میں وہاں کے خالص دیسی باشندے ہیں اور اُن میں اور باہر والوں میں وطن کے اندر یا باہر نسلی اختلاط نہیں ہوا۔"

"میں اُن لوگوں کا ہم خیال ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ جرمنی کے لوگوں نے کبھی غیروں سے شادی بیاہ کا دھبّہ اپنے دامن پر نہیں لگنے دیا۔ وہ عجیب لوگ ہیں اور بالکل خالص ہیں۔ وہ کسی اور قوم کے جیسے نہیں اور آپ اپنی نظیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود کثیر التعداد ہونے کے اُن کی جسمانی خصوصیت یکساں ہے یعنی بہادر نیلی آنکھیں، سُرخ بال اور لمبا قد......"

---

[1] J. Huxley and A. C. Haddon : We Europeans.

ٹے سی ٹس کے انھیں فقروں سے "نارڈک نظریے" کی ابتدا ہوتی ہے۔ آثارِ قدیمہ اور تاریخ کی تحقیقات نے اب یہ بالکل ثابت کر دیا ہے کہ ٹے سی ٹس کا بیان بڑی حد تک غلط ہے۔ جرمنوں کی ایک جسمانی خصوصیت یعنی سُرخ بال کسی طرح بھی نارڈک نسل کی خصوصیت نہیں بلکہ سُرخ بال تو زیادہ تر یہودیوں کے ہوتے ہیں۔[1] ٹے سی ٹس کو سلطنتِ رومتہ الکبریٰ سے باہر کے تاریخی واقعات کا علم نہ تھا اور اس کے زمانے سے پہلے اس خطّے میں جو اب جرمنی کہلاتا ہے جس قدر میل جول ہوا ہے اس کا بھی اسے ظاہر ہے کوئی علم نہ ہو سکتا تھا۔

جرمنی کے تمام باشندے کسی لحاظ سے بھی ہم نسل نہیں قرار دیے جا سکتے۔ شمالی جرمنی کے باشندوں میں نارڈک خصوصیات ضرور ہیں اور وہ اہلِ ڈنمارک سے صورت شکل میں قریب تر ہیں۔ لیکن وسطی اور جنوبی جرمنی کے باشندے "آلپی" یا "یوریشیاٹک" گروہ کے ہیں اور اِس گروہ کی خصوصیات ان میں بدرجۂ تمام پائی جاتی ہیں۔

ایک زمانے میں شمالی جرمنی میں ایسے باشندے ضرور آباد ہوں گے جن کا تعلق نارڈک گروہ سے ہوگا۔ لیکن یہ لوگ ہجرت کر کے اسکنڈی نے ویا چلے گئے اور ان کی جگہ بڑی حد تک "آلپی" یا "یوریشیاٹک" گروہ کے لوگوں نے لے لی۔ تقریباً ۳۵۰ ء قبل مسیح میں موسم کی خرابی کے باعث ان باشندوں کو اسکنڈی نیویا چھوڑ کے پھر جرمنی آنا پڑا ہوگا۔ یہی لوگ گاتھ، برگنڈی اور لومبارڈی کہلائے۔ ان میں اور جرمنی کے آلپی باشندوں میں باہمی لڑائیوں کے سلسلے میں کافی نسلی اختلاط ہوا ہوگا اور

---

[1] *J. Huxley* and *A. C. Huddon* : We Europeans.

نے ان لوگوں کی سادگی اور پاکیزگی کی ضرورت سے کچھ زیادہ تعریف اس لیے کی کہ وہ اہلِ روما کی رنگینی اور عشرت پسندی کی درپردہ مذمت کرنا چاہتا تھا۔ بالکل اسی طرح روسوا ور اُس کے ہم عصروں نے امریکہ کے اصلی باشندوں اور دنیا کے غیر متمدّن حصّوں کے وحشی باشندوں کو بلحاظ اخلاق وعادات اہلِ یورپ سے برتر دکھانے کی کوشش کی تھی۔ کچھ اس قسم کی کوشش اس زمانے میں ٹے سی ٹس نے بھی کی تھی لیکن آج جرمنوں کے نسلی فخر ومباہات کی ابتدا اس کی کتاب کے حوالوں سے ہوتی ہے۔ جدید سائنٹفک نقطۂ نظر سے ٹے سی ٹس کے بیان کو زیادہ قابلِ اعتبار نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کی جغرافیائی معلومات مبہم تھیں یا جن لوگوں کا اُس نے ذکر کیا ہے وہ کسی طرح بھی موجودہ جرمنوں کے آبا واجداد نہیں بلکہ ان کے پیشیرو تھے[1]۔ بہرحال اُس نے اِن قدیم "جرمنوں" کے متعلق یہ فقرے قلمبند کیے۔

"جرمنی کے لوگ میرے خیال میں وہاں کے خالص دیسی باشندے ہیں اور اُن میں اور باہر والوں میں وطن کے اندر یا باہر نسلی اختلاط نہیں ہوا"۔

"میں اُن لوگوں کا ہم خیال ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ جرمنی کے لوگوں نے کبھی غیروں سے شادی بیاہ کا دھبّہ اپنے دامن پر نہیں لگنے دیا۔ وہ عجیب لوگ ہیں اور بالکل خالص ہیں۔ وہ کسی اور قوم کے جیسے نہیں اور آپ اپنی نظیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود کثیر التعداد ہونے کے اُن کی جسمانی خصوصیت یکساں ہے یعنی بہادر نیلی آنکھیں، سُرخ بال اور لمبا قد......"

---

[1] J. Huxley and A. C. Haddon : We Europeans.

ٹے سی ٹس کے انھیں فقروں سے "نارڈک نظریے" کی ابتدا ہوتی ہے۔ آثار قدیمہ اور تاریخ کی تحقیقات نے اب یہ بالکل ثابت کر دیا ہے کہ ٹے سی ٹس کا بیان بڑی حد تک غلط ہے۔ جرمنوں کی ایک جسمانی خصوصیت یعنی سُرخ بال کسی طرح بھی نارڈک نسل کی خصوصیت نہیں بلکہ سُرخ بال توزیادہ تر یہودیوں کے ہوتے ہیں[ا] ٹے سی ٹس کو سلطنتِ رومۃ الکبریٰ سے باہر کے تاریخی واقعات کا علم نہ تھا اور اس کے زمانے سے پہلے اس خطّے میں جواب جرمنی کہلاتا ہے جس قدر میل جول ہوا ہے اس کا بھی اسے ظاہر ہے کوئی علم نہ ہو سکتا تھا۔

جرمنی کے تمام باشندے کسی لحاظ سے بھی ہم نسل نہیں قرار دیے جا سکتے۔ شمالی جرمنی کے باشندوں میں نارڈک خصوصیات ضرور ہیں اور وہ اہلِ ڈنمارک سے صورت شکل میں قریب تر ہیں۔ لیکن وسطی اور جنوبی جرمنی کے باشندے "آلپی" یا "یوریشیاٹک" گروہ کے ہیں اور اِس گروہ کی خصوصیات ان میں بدرجۂ تمام پائی جاتی ہیں۔

ایک زمانے میں شمالی جرمنی میں ایسے باشندے ضرور آباد ہوں گے جن کا تعلق نارڈک گروہ سے ہوگا۔ لیکن یہ لوگ ہجرت کرکے اسکنڈی نے ویا چلے گئے اور ان کی جگہ بڑی حد تک "آلپی" یا "یوریشیاٹک" گروہ کے لوگوں نے لے لی۔ تقریباً سنہ ۳۵۰ قبل مسیح میں موسم کی خرابی کے باعث ان باشندوں کو اسکنڈی نیویا چھوڑ کے پھر جرمنی آنا پڑا ہوگا۔ یہی لوگ گاتھ، برگنڈی اور لومبارڈی کہلائے۔ ان میں اور جرمنی کے آلپی باشندوں میں باہمی لڑائیوں کے سلسلے میں کافی نسلی اختلاط ہوا ہوگا اور

ا۔ J. Huxley and A. C. Huddon : We Europeans.

کروآٹ اور اطالویوں پر حکومت کرتا تھا، جب یورپ میں قومیت پرستی کے احساسات بہت بڑھ گئے تو ہاپسبرگ بادشاہوں کی آسٹروی سلطنت کی بنیاد کمزور ہونی شروع ہوئی۔ پہلے تو اطالویوں نے آسٹروی شکنجے سے رہائی حاصل کی پھر ہنگری میں بغاوتوں اور شورشوں کا سلسلہ شروع ہوا یہاں تک کہ ہنگری کو آسٹریا کا مساوی درجہ عطا کیا گیا اور اہلِ ہنگری کو آسٹرویوں کے ساتھ حکمران طبقے میں جگہ دی گئی لیکن چیک، سلاویکی، کروآٹ اور جنوبی پولستانی بدستور محکوم رہے۔ سلطنت کا نام بدل کر آسٹریا ہنگری Oesterreich-ungarn. رکھا گیا۔ ہاپسبرگ خاندان کا بادشاہ ان دو حکمران طبقوں کے درمیان ایک کڑی کی طرح تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں محکوم اقوام کی شورشوں کے باعث آسٹریا ہنگری کی طاقت جلد کمزور ہوگئی اور بالآخر برّاعظم یورپ کی اس علیحدگی پسند شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا۔

شہنشاہیت کے میدان میں پروشیا آسٹریا کا شاگرد رہا۔ فریڈرک اعظم کے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ یورپ کے باہر نوآبادیاں یا مقبوضات کو حاصل کیا جائے۔

فریڈرک اعظم کے بعد جرمنی نہیں بلکہ فرانس میں نپولین اعظم نے براعظم یورپ میں ایک سلطنت قایم کرنے کی کوشش کی۔ نپولین کے مرنے سے بہت پہلے اس کی یہ سلطنت فنا ہوگئی اور اُس کے بہت بعد یہ خواب پھر ایک جرمن نے دیکھا جو پروشیا کا چانسلر تھا اور جس کے نام سے جرمنی کی علیحدگی پسند شہنشاہیت کا دوسرا دَور وابستہ ہے۔ یعنی پرنس آٹو فان بسمارک Otto Von Bismark.

بسمارک کے سامنے سب سے بڑا کام یہ تھا کہ جرمن ریاستوں کو متحد کر کے ایک جرمن سلطنت میں جذب کرلے اور اس طرح ایک جرمن قوم تیار ہو جائے جو دوسری اقوام پر حکومت کر سکے۔ دو ہی مرکز ایسے تھے جہاں سے متحدہ جرمن قومیت کی تعمیر کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ ایک آسٹریا اور دوسرے پروشیا۔ اِن میں سے بسمارک کا تعلق پروشیا سے تھا اور اُس نے جرمن سلطنت کا مرکز برلن کو بنایا۔ اگر وہ پروشیا کے دربار کا چانسلر نہ بھی ہوتا تب بھی وہ غالباً ہٹلر کی طرح وی آنا پر برلن کو فوقیت دیتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آسٹریا میں بہت سے غیر جرمانی عناصر موجود تھے اور اِن میں سے ہنگری کی حیثیت برابری کی تھی اس کے علاوہ اس وقت شہنشاہیت سے زیادہ اہم سوال متحدہ جرمن قومیت کی تعمیر کا تھا۔ ۱۸۶۷ء میں بسمارک نے شمالی جرمن وفاق کی بنیاد ڈالی۔ اس وِفاق کا صدر پروشیا کا بادشاہ اور وفاق کا چانسلر پروشیا کا چانسلر بسمارک بنا۔ اس سے ایک سال قبل ۱۸۶۶ء میں پروشیا اور آسٹریا میں لڑائی ہو چکی تھی اور پروشیا نے فتح کے بعد آسٹریا کو جرمن معاملات سے قریب قریب بے دخل کر دیا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ چار اہم جنوبی جرمن ریاستوں بویریا، بادِن، ہیس اور وُرتم برگ نے پروشیا کے شمالی جرمن وفاق میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

لیکن بسمارک کا دماغ صرف سیاست ہی میں فرد نہیں تھا۔ اس کی سرپرستی میں جرمنوں نے لڑنا بھی سیکھا تھا۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء میں فرانس اور پروشیا کی لڑائی میں پروشیا کو غیر معمولی کامیابی ہوئی اور الساس اور لورین کے صوبے جو صدیوں قبل فرانس کے قبضے میں چلے گئے تھے

جرمنی کو ملے۔ اِس فتح کے بعد چاروں مذکورۂ بالا جرمن ریاستیں بھی جرمن وِفاق میں شریک ہوگئیں۔ ۱۸۷۱ء میں وِفاق کا نام بدل کے سلطنت .REICH رکھا گیا۔ اگرچہ حکومت کا دستور تقریباً وہی رہا جو ۱۸۶۷ء کے شمالی جرمن وِفاق کا تھا۔ پروشیا کا بادشاہ جرمنی کا قیصر بنا۔ یہ جرمن سلطنت پچیس چھوٹی بڑی ریاستوں پر مشتمل تھی۔

متحدہ جرمن قومیت اور متحدہ جرمن سلطنت کے وجود میں آتے ہی شہنشاہیت کا سوال بھی پیدا ہوا۔ فرانس نے الساس لورین کے بجائے فرانسیسی ہند چینی جرمنوں کے نذر کرنا چاہا لیکن بسمارک غیر یورپی نوآبادیوں کے جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اس نے الساس اور لورین ہی کو لیا۔[۱]

اس طرح اِس دوسری جرمن سلطنت .REICH کا نظام العمل ابتدا میں یورپ ہی میں سلطنت قایم کرنے کا تھا۔ بسمارک نے شلیسوگ ہول اشتاین کو بھی اسی یورپی سلطنت کے لیے حاصل کیا تھا۔

اِسی زمانے میں جرمن تجارتی کمپنیوں کی ترقی کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اوسوالڈ کمپنی نے ۱۸۷۴ء میں اس کی کوشش کی کہ زنجبار جرمنی کے زیرِ اثر آجائے لیکن اس تجویز کو بھی بسمارک نے مسترد کر دیا۔

ایک طرف تو بسمارک اور رائیش تاگ .Reichstag کی اکثریت نوآبادیاں اور غیر یورپی مقبوضات کے حاصل کرنے سے گریز کر رہی تھی لیکن دوسری طرف جرمنی میں دو گروہ مسلسل اس کی کوشش کر رہے تھے کہ جرمنی بھی دوسرے یورپی دول کی طرح بیرونی مقبوضات حاصل

۱ـــ P. T. Moon: Imperialism and World Politics.

کرنے کی کوشش کرے۔

اِن میں سے پہلا اور نہایت درجہ ذی اثر گروہ جرمن تاجروں اور سرمایہ داروں کا تھا اور بالآخر ان کے اثر اور ان کی کوشش سے بسمارک کو اپنی حکمتِ عملی بدلنی پڑی[^۵] ۔ افریقہ اور مشرقِ بعید کے جن حصّوں میں جرمن سرمایہ یا جرمن تجارت پھیل رہی تھی وہاں جرمن مقبوضات حاصل کرنے کی تجاویز پر بھی غور ہونے لگا۔

دوسرا گروہ معاشیئین اور مؤرخین کا تھا۔ یہ گروہ بہت عرصے سے مقبوضات کی تحصیل کے فواید گِنا رہا تھا اور ۱۸۸۵ء تک اِس قسم کی تیس جامع کتابیں شایع ہوئیں۔ اِن میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر فریدرش لِسٹ Friedrich List. ہی۔ اس کی کتاب ۱۸۴۱ء میں شایع ہوئی جس میں اس نے اس امر پر زور دیا ہی کہ مقبوضات ہی کے ذریعے صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوسکتا ہی، درآمد اور برآمد بڑھ سکتی ہی اور جرمنی ایک قابل وقعت بحری بیڑہ تیار کرنے کے قابل ہوسکتا ہی۔ ۱۸۴۸ء میں ایک اور ماہرِ معاشیات روشر ROSCHER. کی کتاب Kolonien Kolonial Politik und Auswanderung شایع ہوئی جس میں معاشی نقطۂ نظر سے سمندر پار مقبوضات حاصل کرنے کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم کتاب ۱۸۶۷ء میں شایع ہوئی جس کا مصنف لوتھار بیوشر Lothar Bucher. وزارت خارجہ کے دفتر میں عہدہ دار تھا۔ اس نے جزایر فلی پاین، سینٹ طامس اور ٹمور کے نام گنائے کہ یہ

[^۵]: P. T. Moon. Imperialism and World Politics.

سب مقامات جرمن مقبوضات بننے کے لیے بہت موزوں ہیں۔ نامور مورخین میں سے ترائیتشکے Treitschke. جو جرمن قومیّت کا بڑا حامی تھا، نوآبادیاں حاصل کرنے پر بھی بہت زور دے رہا تھا۔ جرمن مشنریوں میں سے فریدرش فابری Fried rich Fabri. نے ۱۸۷۹ء میں "کیا جرمنی کو مقبوضات کی ضرورت ہے؟" Bedarf Deusch land der Kolonien لکھی۔ اس میں مقبوضات حاصل کرنے کے تمام تر فواید فابری نے واضح کیے۔ منجملہ ان کے یہ کہ جرمن تمدن وحشی اقوام کو سکھایا جائے۔ پروپاگنڈا کی حد تک سب سے زیادہ ممتاز نام ہیوباشلائی ڈن Huebbe-Schleiden. کا ہے جس کی کتاب Deutsche Kolonisation. ۱۸۸۱ء میں شایع ہوئی۔

اس پروپاگنڈا اور جرمنی کے تین چار انتہائی امیر تاجروں اور سرمایہ داروں کی کوششوں سے ۱۸۷۵ء تا ۱۸۸۳ء کے عرصے میں بسمارک کی حکمتِ عملی بدلنے لگی۔ اِن امیر سرمایہ داروں میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر لیوڈرِتس Luederitz تھا جو بریمن میں تاجر تھا۔ اُسی نے ۱۸۸۳ء میں جنوب مغربی افریقہ میں پہلے جرمن مقبوضے کی بنیاد ڈالی۔ ہامبرگ کے ایک اور تاجر اور سرمایہ دار گوڈفرائے Godeffroy. نے مشرق بعید میں جرمن سلطنت کے بیج بوئے۔ جرمنی کے سرمایے پر بھی ان تاجروں کا بڑا اثر تھا چنانچہ گوڈفرائے مشہور جرمن بنک Norddeutsche. Bank. کا تقریباً مالک تھا۔ ان کے علاوہ دو یہودی سرمایہ داروں بلائیش روئے ڈر Bleichröder. اور فان ہانزمان Von Hansemann. نے جو بسمارک کے خاص مشیر

بھی تھے۔ بسمارک کی رائے بدلنے میں بڑا حصّہ لیا۔

بہر حال ۱۸۸۳ء میں جنوب مغربی افریقہ میں جرمنی کی سمندر پار کی سلطنت کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بعد مشرقی اور مغربی افریقہ کے دوسرے حصّوں۔ جزایر جنوب South Sea Islands. اور نیو گنی New Guinea. میں جرمن مقبوضات حاصل ہو گئے۔

قیصر ولہلم ثانی نے ۱۸۹۰ء میں بسمارک کو عہدہ چانسلری سے برطرف کر دیا۔ بسمارک زیادہ تر یورپ کی سیاسیات میں مصروف رہا اور سمندر پار کی شہنشاہیت کی اس کے نزدیک ثانوی اہمیت تھی۔

قیصر ولہلم کی حکمتِ عملی اس کے بالکل برعکس تھی۔ یورپ اور دنیا کی سیاسیات کی حد تک اس کی حکمتِ عملی اس قدر غلط قسم کی تھی اور اس حد تک بے پروائی پر مبنی تھی کہ پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی کو تقریباً تمام دنیا سے لڑنا پڑا۔ قیصر کے نزدیک مقبوضات اور نوآبادیوں کی بڑی اہمیت تھی۔

مشرق کی طرف بڑھنے کی پُرانی آسٹروی پالیسی Drang Nach Osten. کو اُس نے جرمنی کے لیے اختیار کیا۔ بلقان کی ریاستوں اور ٹرکی پر اثر قایم کیا کہ مشرق کی طرف بڑھنے کا موقع ملے اور قسطنطنیہ سے بصرہ تک ریل بنانے کی تجویز کی۔ دوسری طرف اُس نے اعلیٰ پیمانے پر بحری بیڑہ بنانا شروع کیا۔ یہ بحری کھلونے جواب تک برطانیہ عظمیٰ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھے تھے، برطانیہ کو مطلق پسند نہ آئے[1]۔ یہاں تک کہ اِس حکمتِ عملی نے ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کو عالمگیر بنا دیا اور جب یہ جنگ ختم ہوئی تو قیصر کی حکومت کی طرح اس دوسری جرمن سلطنت ZWEITE-Reich. کا بھی

---

[1] *H. A. L. Fisher* : A History of Europe.

خاتمہ ہوگیا۔

وائمار جمہوریت جو ۱۹۳۳ء میں ختم ہوئی اس قدر کمزور تھی کہ شہنشاہیت تو ایک طرف، خود جرمنی پر ہی مشکل سے حکم چلتا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں نانسی (نازی) Nazi. جماعت برسر اقتدار آئی اور اس کا لیڈر ہر ہٹلر جرمنی کا آمر بنا۔ اس دور کو جرمن، تیسری جرمن سلطنت Dritte-Reich. کہتے ہیں۔ اس سلطنت کی بنیاد شدید ترین اور سنگین ترین قسم کی علیحدگی پسند شہنشاہیت پر ہی اور اس شہنشاہیت کی علیحدگی پسندی کا اصل اصول نسلی برتری کا نظریہ ہی۔ قدیم ہندستان میں ذات پات کی قید کے بعد سے شاید پھر کبھی نسلی تعصب نے اس قدر مہیب شکل نہیں اختیار کی تھی۔

جرمن قوم برتری اور طاقت کے حقوق کے نظریوں کو ہمیشہ سے پسند کرتی آئی تھی۔ خود جرمن فلسفیوں نے اکثر انہی اصول کو پسند کیا اور ان فلسفیوں کا نانسی عقاید پر اچھا خاصا اثر پڑا ہی اور یوں تو ہیگل Hegel. فشطے Fichte نی تشے Nietzsche. اور ان کے علاوہ اور بھی کئی فلسفیوں، نیز مصنفوں مثلاً شِلَر Schiller. اور مورخوں مثلاً ترائی تشکے Treitschke. کا نانسی عقاید اور ہٹلر کی کتاب "میری جد و جہد" Mein Kampf پر اثر پڑا ہی لیکن ہم مثال کے طور پر صرف نی تشے کی کتاب "بقول زردُشت" Alscsprach Zarathustra کے کچھ خیالات نقل کرتے ہیں جو نسلی برتری "ترقی یافتہ انسان" کی برتری جنگ وجدال کی خوبی اور بنی نوعِ انسان میں عدم مساوات پر زور دیتے ہیں۔

(۱) "انسان کی نظروں میں بندر کیا ہی؟ ایک ہنسنے کی چیز، ایک شرم کی چیز اور فوق الانسان کی نظروں میں انسان بھی یہی بنے گا:۔ ایک ہنسی کی

چیز، ایک شرم کی چیز "

"انسان ایک رسّی ہی جانور اور فوق الانسان کے درمیان ـــــ ایک رسّی ایک خلیج کے اوپر" (زردشت کا مقدمہ)

(۲) "میرے جنگجو بھائیو۔ مَیں تمھیں دل سے چاہتا ہوں........"

"مَیں تمھارے دل کی نفرت اور حسد کو جانتا ہوں۔ تم اتنے بڑے نہیں بن سکے ہو کہ نفرت اور حسد کو ترک کر سکو۔ تب اتنے بڑے تو بن جاؤ کہ اِن (نفرت اور حسد) سے نہ شرماؤ "

"امن کو تم اس لیے چاہو کہ وہ نئی لڑائیوں کا ذریعہ ہی ـــــ اور امن کے مختصر عرصے کو امن کے طویل عرصے سے زیادہ پسند کرو"

"مَیں تمھیں کام کرنے کی نصیحت نہیں کرتا، لڑنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ مَیں تمھیں امن کا مشورہ نہیں دیتا، فتح کی تلقین کرتا ہوں۔ چاہیے کہ تمھارا کام جنگ کرنا ہو، اور تمھارے لیے امن، فتح" (حصۂ دوم۔ باب دہم "جنگ اور جنگجو")

(۳) کچھ لوگ خراب نسل اور خراب نسب کے ہوتے ہیں، اُن کے چہروں میں جلّادوں اور خون کی بو سونگھ کے سُراغ لگانے والے کتّوں کی مشابہت پائی جاتی ہی"

"انصاف مجھ سے یہ کہتا ہی:۔ "سب انسان برابر نہیں"

ایک ہزار پُلوں اور بندرگاہوں پر وہ مستقبل کے لیے جمع ہوں گے اور ہمیشہ ان میں اور زیادہ لڑائیاں ہوں گی اور عدم مساوات اور زیادہ ہوگی ...."

"اپنی لڑائیوں میں وہ تشبیہوں اور تصویروں کے مؤجد بنیں گے

اور اِن تشبیہوں اور تصویروں سے وہ باہم گرعظیم لڑائی لڑیں گے"
(حصّۂ دوم۔ اُنتیسواں باب "تارنتو کی مکڑی")

جہد للبقا، فوق الانسان کی برتری کے نظریوں کے ساتھ ساتھ ناتسی نظام العمل نے "نسل" کے تمام کہنہ نظریے بھی نئے سِرے سے زندہ کیے۔ میکس مؤلر، شلایشر، کوزی نا کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اِن سب مصنّفین کے نظریوں میں اور بھی کئی ترمیمیں کی گئیں اور نسل پرستی کو ناتسی حکمتِ عملی کا مذہب بنایا گیا۔

ناتسی جرمنی میں جرمن "قوم" اور جرمن "نسل" تقریباً ہم معنی سمجھے جاتے ہیں۔ قوم کے لیے بجائے پُرانے لفظ Nazion کے یہ لوگ لفظ Volk. کو استعمال کرتے ہیں جس میں ایک طرح سے نسل کا مفہوم بھی شامل ہی۔

ہٹلر نے اپنی پارٹی کے زور پکڑنے کی پوری سرگزشت اپنی سوانحمری میں بیان کی ہی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اس کی جماعت اس قدر زور پکڑ گئی کہ جرمنی کے پُرانے فوجی لیڈر جنرل لیوڈن ڈورف Ludendorff. نے بھی اس کا ساتھ دینے کا تہیّہ کر لیا۔ چنانچہ اسی سال اِن دونوں نے مِل کر سلطنت پر قبضہ کر لینے اور اس کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش میں اِن دونوں کو ناکامی کا مُنھ دیکھنا پڑا۔ ہٹلر گرفتار ہو گیا اور اگرچہ ایک ہی سال کے اندر اُسے رہا کر دیا گیا لیکن پھر اس کو اتنی ہمّت نہیں ہوئی کہ غیر قانونی طور پر حکومت کو اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرے۔

لیکن اس درمیان میں اس کی پارٹی رایش تاگ میں زور پکڑ رہی تھی یہاں تک کہ بالآخر اس کی اکثریت ہو گئی۔

پارٹی کا نظام العمل یہ تھا کہ اشتراکیوں، وائمار جمہوریت اور سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کا قلع قمع کیا جائے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ تمام جرمنوں کو ایک وسیع تر جرمنی میں متحد کر لیا جائے (دوسرے الفاظ میں یہ کہ آسٹریا کو جرمنی میں ضم کر لیا جائے) معاہدۂ ورسائی کی تنسیخ کی جائے۔ یہودیوں کو ملکی حقوق سے محروم کیا جائے۔ بلا محنت کی ذاتی آمدنیوں کو بند کر دیا جائے۔ تمام تجارتی اداروں کو حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے، بڑی بڑی دکانوں کو عام ملکیت قرار دیا جائے۔ بچوں کو مزدوری پر نہ لگانے دیا جائے، ذہین بچوں کے لیے مفت تعلیم کا انتظام کیا جائے، اخبارات کی زباں بندی کی جائے، ملک کی از سرِ نو فوجی تعلیم و تنظیم کی جائے، آسٹریا، پولینڈ، چیکوسلاویکیا اور ہر کہیں کے جرمن باشندوں کو جرمن متحد قومیت میں شامل کیا جائے۔ "پولستانی تنگنائے" کو ختم کر دیا جائے، جرمن سلطنت کو مشرق کی طرف بڑھایا جائے، وسطِ یورپ میں جرمنی سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

جنوری ۱۹۳۳ء میں ہٹلر جرمنی کا چانسلر بنا، ۱۹۳۴ء میں ہنڈن برگ کے مرنے کے بعد صدر کا عہدہ بھی چانسلر کے عہدے میں ضم کر دیا گیا۔ اور وائمار جمہوریت نے بالکل دم توڑ دیا۔ تیسری جرمن سلطنت کا آغاز ہوا۔

ہمیں اس نظامِ شہنشاہیت کا "نسل" کے نقطۂ نظر سے معاینہ کرنا ہے۔ جرمنی میں پہلا سوال یہودیوں کا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ سے ان سے مذہبی بنا پر سخت تعصب تھا لیکن صنعتی انقلاب کے بعد اپنی تجارتی صلاحیتوں کی وجہ سے یہودیوں نے اچھا خاصا زور پکڑا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بسمارک کے دو مشیر جن کے اثر سے اس کی حکمتِ عملی میں تبدیلی

ہوتی یہودی تھے۔ لیکن اس کے باوجود جنگِ عظیم سے پہلے سرکاری طور پر یہودیوں سے کچھ تعصب ضرور برتا جاتا تھا اگرچہ یہ تعصب نیم یہودیوں سے نہیں برتا جاتا تھا[1]۔ قیصر ولہلم کے زمانے میں یہودیوں کو ملکی حقوق تو حاصل تھے لیکن فوجی اور بحری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدے اُن کو نہیں دیے جاتے تھے۔ یونیورسٹیوں، عدالتوں، سول سروسوں اور طبقۂ وکلا میں اُس زمانے میں یہودی کافی تعداد میں تھے[2]۔ تجارت اور سرمایے میں یہودیوں کا بڑا دخل تھا۔ بڑے بڑے صنعتی کارخانوں، دُکانوں اور اہم اخبارات کے مالک یہودی تھے[3]۔ دستورِ وائمار نے یہودیوں کو اور زیادہ حقوق دیے۔ اِس دستور نے جس پر ۱۹۱۸ء میں وائمار جمہوریت کی بنیاد قایم ہوئی، تمام جرمنوں کو قانونی طور پر مساوی قرار دیا اور یہودی دوسروں کے بالکل برابر سمجھے جانے لگے۔ دستورِ وائمار کا مصنف ڈاکٹر ہیوگو پروائس Hugo Preuss. خود یہودی تھا[4]۔ اِس دستور کے نافذ ہوتے ہی جرمنی میں یہودیوں کا اقتدار بہت بڑھ گیا کیونکہ صنعت، تجارت اور اخبارات پہلے ہی سے ان کے ہاتھ میں تھے۔ ہٹلر کی نیشنل سوشلسٹ Nazional Sozialist. تحریک یہودیوں کے اِس اقتدار کا شدید ردِ عمل بن گئی اور نسل کے متعلق نظریوں کو اور زیادہ اہمیت اس وجہ سے دی جانے لگی کہ ان کا پروپاگنڈا کرکے عام رعایا کو یہودیوں کے خلاف بھڑکایا جائے۔ نازیوں نے علیحدگی پسندی کا سبق ایک حد تک یہودیوں سے ہی سیکھا تھا اور

---

[1] و [2] و [3] و [4] W. B. Munro: The Government of Europe.

۱۹۳۳ء میں جب ہٹلر کے ہاتھ میں حکومت آئی تو اس حربے کو ہزار گنی شدت اور بہیمیت کے ساتھ یہودیوں ہی کے خلاف استعمال کیا گیا۔ یہودیوں کے خلاف جہاد کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ پہلے تو یہودیوں کی دوکانوں کا بائیکاٹ کرایا گیا۔ پھر انھیں سول ملازمتوں سے نکالا گیا۔ ریلوے اور بنکوں سے یہودیوں کو بے دخل کیا گیا۔ وکالت، تدریس اور اخبار نویسی کے پیشوں کو ان کے لیے تقریباً ممنوع قرار دیا گیا۔ یہاں تک کہ یونیورسٹیوں نے یہودی پروفیسروں کو (جن میں پروفیسر آئن شٹائن Einstein. بھی شامل ہیں) برطرف کیا اور یہودی طلبا کو داخلے سے روکا۔ ۱۹۳۵ء میں قانوناً یہودیوں کے مُلکی حقوق چھین لیے گئے۔ ۱۹۳۵ء ہی میں ایک اور قانون نافذ کیا گیا جس میں "جرمن خون اور جرمن عزت کی محافظت" کے لیے یہودیوں کو ممانعت کی گئی کہ وہ جرمن نسل یا اسی نوع کی کسی نسل کے افراد سے شادی بیاہ کریں۔ انتہا ہو گئی کہ باغوں میں یہودیوں کے بیٹھنے کے لیے زرد بنچیں علیحدہ ہیں اور ہمارے ناظرین میں سے جن کو جرمنی جانے کا اتفاق ہوا ہے اُنھوں نے کئی تفریح گاہوں، ہوٹلوں، حماموں وغیرہ کے دروازوں پر Juden nicht Vorwunscht. کی تختی لگی دیکھی ہوگی۔

ہٹلر اور نازی پارٹی کے جنونِ نسل کا باقاعدہ مطالعہ کرنا ہو تو ہٹلر کی خود نوشت سوانحعمری "میری جدوجہد" .Juden nicht Vorwunscht میں اس کی بہترین سرگزشت موجود ہے۔

ہٹلر نے لکھا ہے کہ اسے شروع میں یہودیوں سے کوئی تعصب نہ تھا۔ لیکن جب اس نے سیاسیات کا مطالعہ کیا اور یہ دیکھا کہ سوشل ڈیموکریٹ پارٹی

کے تمام اخبارات یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں تو وہ کھٹکا۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ Zionism. کی تحریک کو پرکھنے کے بعد اس پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہودی دراصل جرمن نہیں اور اس حقیقت کو معلوم کرکے اسے روحانی خوشی حاصل ہوئی۔[1]

"میری جدوجہد" کی پہلی جلد کے دسویں باب میں اُس نے اِس رائے کا اظہار کیا ہے کہ دراصل نسل کی بقا اور تحفظ قوم کی بقا کا ضامن ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے "پرانی سلطنت کے انحطاط کا باعث یہ تھا کہ نسل کے مسئلے پر توجہ نہیں کی گئی اور تاریخی ارتقا میں نسل کی جو اہمیت ہے اُسے محسوس نہیں کیا گیا۔ کیونکہ قوموں کی زندگی میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ محض اتفاق پر مبنی نہیں بلکہ وہ نوع اور نسل کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کی کوششوں کا قدرتی نتیجہ ہوتے ہیں۔"

گیارھواں باب تمام تر "نسل" سے متعلق ہے۔ اس کا عنوان "لوگ اور نسل" Volk und Rasse. ہے۔ ہمارے ناظرین جو یہ دیکھ چکے ہیں کہ جرمنی یا کسی اور ملک میں کوئی خالص نسل نہیں، نسل کے اِن عجیب و غریب نظریات کو پڑھ کر محظوظ ہوں گے جو ہم درج ذیل کرتے ہیں:۔

"اگر فطرت یہ نہیں چاہتی کہ کمزور افراد زیادہ طاقتور افراد کے ساتھ ہم بستر ہوں تو فطرت یہ اور بھی کم چاہتی ہے کہ ایک برتر نسل کسی

---

[1] "—den dass der Jude Kein Deutscher war waste ich zu meiner innern Glueklichen zufrieden heit Schon endgultig" (Mein Kampf Erster Band 2 Kapital).

کم تر نسل سے نسلی اختلاط کرے۔ کیونکہ اس صورت میں اس کی (برتر نسل کی) وہ تمام کوششیں بیکار ہو جائیں گی جو اُس نے لاکھوں سال سے اس لیے کی ہیں کہ زیادہ ارتقا یافتہ انسان پیدا ہوں۔"

"نسلی اختلاط کے ہمیشہ یہ نتیجے ہوتے ہیں:۔

(ا) برتر نسل کا معیار پست ہو جاتا ہے۔

(ب) دماغی اور جسمانی انحطاط شروع ہو جاتا ہے، جس سے اس کا حیاتی جوہر آہستہ آہستہ لیکن باقاعدہ طور پر فنا ہونے لگتا ہے۔"

"بعض خیالات بعض خاص لوگوں (بہ معنی اقوام) کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ یہ اُن خیالات کی حد تک صحیح ہے جن کی بنیاد سائنس کی حقیقتوں پر نہیں بلکہ جذبات کی دنیا پر ہے۔ ان سے ایک باطنی احساس Inners Erleben. جھلکتا ہے۔"

"ماضی کے تمام بڑے بڑے تمدن اس لیے انحطاط پزیر ہوئے کہ اصلی جس میں تخلیقی مادہ تھا، نسل خون میں خرابی (اختلاطِ نسلی کے باعث) پیدا ہونے کی وجہ سے فنا ہو گئی۔"

"انسانی تمدن کا ہر ظہور، فن، سائنس اور فنی قابلیت کی ہر پیداوار جس کو ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تقریباً بالکلیہ آریائی قوتِ تخلیق کا نتیجہ ہے۔ اسی سے اس نتیجے کی توثیق ہوتی ہے کہ آریائی ہی نے ایک برتر قسم کی انسانیت کی بنیاد ڈالی۔ اس لیے وہ "انسان" کی خاص الخاص نوع کی نمایندگی کرتا ہے۔"

اسی باب میں حاکم اور محکوم قوم کے تعلق کے متعلق ارشاد ہوتا ہے

"اگر آریائی اپنی مفتوح کم تر نسلوں سے کام نہ لے سکے ہوتے تو وہ

اس قابل نہ ہوتے کہ جدید ترقسم کے تمدّن کی سڑک پر سب سے پہلے قدم رکھیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے اگر وہ چند کارآمد جانوروں کو مطیع نہ کر سکتے تو کبھی میکانکی طاقت کے موجد نہ بن سکتے جس نے ان کو بالآخر اُن جانوروں سے بے نیاز کر دیا۔" موُر[1] (حبشی) اپنا کام کر چکا اب اس کو رُخصت ہونے دو"—— یہ جملہ بدقسمتی سے بہت گہرے معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔

"آریائی کی عظمت کا انحصار دماغی طاقتوں پر نہیں بلکہ اس امر پر ہے کہ وہ رضامندی کے ساتھ اپنی تمام صلاحیتیں ملّت کی خدمت کے لیے وقف کر دیتا ہے"۔ آریائی قوم کی اس نام نہاد صلاحیت کو کہ فرد اپنے تمام اغراض کو ملّت کے لیے قربان کر دیتا ہے، بیان کرنے کے لیے ہٹلر نے جرمن لفظ Pflichterfülung. خاص معنی میں استعمال کیا ہے۔

ہٹلر کا کہنا یہ ہے کہ "آریائی" کے برعکس یہودی ہمیشہ اپنے ذاتی اغراض کو ترجیح دیتا ہے اور اس کی حیثیت اُس زہریلے کیڑے کی ہے جو کسی انسان کے جسم کے خون سے پرورش پاتا ہے لیکن اسی انسانی جسم کو نقصان پہنچاتا ہے۔

اس کے بعد ہٹلر نے یورپ میں یہودیوں کے اثر کے ارتقا کی ایک عجیب و غریب تاریخ درج کی ہے اور وہ یہ کہ (۱) پہلے تو یہودی تاجر بن کے آیا اور اُس نے یہاں (یورپ میں) بسنے کا ارادہ کیا، (۲) دوسرے دوَر میں اس نے تجارت کو بالکل اپنے ہاتھوں میں لے لینے کی کوششیں شروع کیں (۳) شہروں کے خاص خاص حصّوں میں آباد ہو گیا اور تجارت اور لین دین پر کامل قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح

[1] یہ "آتھیلو" Othello. کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس نے ہر ریاست کے اندر اپنی ایک اور ریاست بنائی (۴) اس دور میں وہ صرف تجارت اور سرمایہ ہی نہیں بلکہ آراضی کا بھی مالک بننے لگا، جن کو وہ خود کاشت نہیں کرتا تھا بلکہ لین دین اور فایدے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ اس دور میں عوام النّاس اُس کے کمینہ پن اور اُس کے ظلم کی وجہ سے اس سے نفرت کرنے لگے (۵) پانچویں دور میں عوام النّاس کی اس نفرت کا توڑ کرنے کے لیے یہودی نے حکومتوں کو رشوت دینی شروع کی (۶) اس دور میں جب کہ جاگیرداری کا راج ختم ہوا اور بادشاہوں نے زور پکڑا تو یہودی اِن بادشاہوں کا مہاجن اور خوشامدی بنا۔ (۷) بادشاہوں کی طاقت کے زوال میں اس نے مدد کی اور اِس درمیان میں بہت سے سرکاری اعزازات حاصل کیے۔" بالآخر بپتسمہ لے کر اُس نے وہ تمام حقوق و مراتب حاصل کر لیے جو اُس قوم کے لوگوں کے لیے تھے جن کا وہ شکار کھیل رہا تھا (۸) آٹھویں دور میں یہودی نے زبان اچھی طرح سیکھ لی اور جس جس ملک میں وہ آباد تھا اس کا ظاہری تمدّن اختیار کر لیا۔" اگرچہ یہ عجیب اور مہمل معلوم ہوتا ہے لیکن اُس نے یہاں تک جرأت کی کہ اپنے آپ کو ٹیوٹن کہنا شروع کیا۔" گوئٹے نے بہت شدّت سے اس کی شکایت کی کہ قانوناً یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان شادی بیاہ کی ممانعت نہیں۔ (۹) جب جمہوری خیالات نے زور پکڑا تو وہ "روشن خیالی"، "ترقی"، "آزادی" اور "انسانیت" جیسے الفاظ دہرانے لگا۔ اصل میں یہودی اپنے گروہ کے لیے حفاظت اور ترقی کا راستہ کھولنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے جمہوریت اور پارلیمانی آئین کی حمایت کی۔ (۱۰) صنعت و حرفت کی ترقی اور ساتھ ہی ساتھ مزدور پیشہ طبقے کی تحریکات کی ابتدا ہونے

کے بعد ایک طرف تو یہودی نے مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ محنت لینے اور کم سے کم تنخواہ دینے کو سرمایہ دارانہ نظام قایم کیے اور دوسری طرف اپنی اس حکمتِ عملی کے شکار مزدوروں کی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کیا اور اُن میں اچھا خاصا اثر قایم کرلیا" اس طرح اُس کے خلاف جو طبقہ لڑ رہا تھا وہ خود اُس کا لیڈر بن گیا (۱۱) گیارھواں دَور زائینیت Zionism. کی تحریک کا ہی۔ یہودیوں کا ارادہ ہرگز کسی ایسی ریاست کے قایم کرنے کا نہیں ہی جس میں وہ آباد ہوں بلکہ وہ اپنی بین الاقوامی دغابازی اور چوری کے لیے فلسطین میں ایک مرکزی نظام قایم کرنا چاہتے ہیں (۱۲) یہودی ظالموں کا عروج جیسے رُوس میں۔

یہودیوں کی یہ پُر تعصب سرگزشت سنانے کے بعد ہٹلر یہودیوں کے "اصلی خطرے" کی طرف اشارہ کرتا ہی — یعنی نسلی اختلاط:۔

" کالے بالوں والا یہودی نوجوان کئی کئی گھنٹے تک شیطنت سے گھورتا ہوا اُس لڑکی کی تاک لگائے انتظار کرتا رہتا ہی جس کو وہ خراب کرنا چاہتا ہی وہ اس لڑکی کے خون کو نجس کر دیتا ہی اور اُسے اُس کے (قوم کے) لوگوں سے چُرا لیتا ہی"[1]

---

[1] اِس جملے کا اصلی لُطف ہٹلر کی جرمن عبارت ہی میں آسکتا ہی، اُس کے غصّے اور رنج کا ترجمہ مشکل ہی:۔

"Der Shwarzhaarige Judenjunge Lavert Stundenlang, Satanische Freude in Seinem Gesicht, Auf das ahnungslose madchen, das er mit Seinem Blute schändet und damit Seinem,— des Mädchens Volke raubt.

اپنی کتاب کے دوسرے حصّے (دسویں باب) میں بھی یہودیوں اور "آریوں" کے اس جنسی اختلاط پر ہٹلر نے زہر اُگلا ہی:۔ "باقاعدہ طور پر یہ حبشی نما طفیلی کیڑے (یہودی) جو ہمارے قومی جسم میں ہیں ہماری معصوم ہلکے بالوں والی لڑکیوں کو خراب کرتے ہیں اور ایک ایسی چیز کو غارت کرتے ہیں جو پھر اس دنیا میں حاصل نہیں ہو سکتی"۔

"میری جدوجہد" کے دوسرے حصّے میں اُس نے "نسل" کے نظریوں کی بنیاد پر سیاسیات کی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی ہی۔ اس سلسلے میں پہلی چیز Volkisch. تصوّر" ہی۔ اِس تصوّر سے دنیا کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ "بنیادی نسلی عناصر بنی نوعِ انسان کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں"۔ اُصولاً ریاست ایک مقصد حاصل کرنے کے لیے محض ایک ذریعہ ہی اور مقصد یہ ہی کہ "بنی نوعِ انسان کی نسلی خصوصیتیں باقی رکھی جائیں"۔ اس خودساختہ تصوّر سے بلا کسی منطقی استدلال کے ہٹلر نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہی:۔ "اس لیے Volkisch. اُصول کی بنیاد پر ہم یہ تسلیم نہیں کرسکتے کہ ایک نسل دوسری نسل کے برابر ہی"۔ ایک ایسی دنیا میں جو دوغلوں اور حبشی نما لوگوں سے بھری ہوگی انسانی حُسن اور نجابت کے تمام معیاری تصوّرات اور انسانیت کے معیاری مستقبل کی تمام اُمیدیں ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائیں گی۔

اسی زمانے میں امریکہ میں نسلی امتیاز اور نسلی تعصبات کے پروپاگنڈے کی کتابیں لکھی جا رہی تھیں مثلاً میڈیسن گرانٹ کی Passing of the great Race. یا اسٹوڈارڈ کی اس سے بھی زیادہ مہمل کتاب Rising Tide of Colour. ہم اِن دونوں کتابوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ لیکن نسلی امتیاز کے اِس امریکی پروپاگنڈا اور امریکہ سے

نسلی امتیاز و تفریق کو ہٹلر نے بہت پسند کیا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہی "ہماری بے مثل جرمن جمہوریت (وائمار جمہوریت) میں نہیں بلکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کوشش کی جارہی ہی کہ عقل سلیم کے مشورے پر کم سے کم تھوڑا بہت تو عمل کیا جائے .... بعض نسلوں کو امریکہ کے ملکی حقوق دینے سے انکار کرکے اُنھوں نے (اہلِ امریکہ نے) اُن اصول کی ابتدا کی ہی جن سے مشابہ اُصول پر ہم اپنی ریاست کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں۔"

آخر آخر میں یہ بھی سُن لیجیے کہ اپنے شاہکار میں ہٹلر صاحب ہندستان اور ہندستانیوں کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

دوسرے حصّے کے چودھویں باب میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔ "انگلستان ہندستان کو اُس وقت تک نہیں کھوئے گا جب تک کہ نظامِ حکومت کی مشنری میں نسلی انتشار پیدا نہ ہوگا (اور فی الحال ہندستان میں اس کا کوئی سوال نہیں) .... ہندستانی شورشوں سے یہ (ہندستان کی آزادی ملنی) کبھی ممکن نہیں۔"

[یہاں "نسلی انتشار" کے معنی یہ ہیں کہ ہندستانیوں کو انگریزوں سے میل جول بڑھانے یا انگریزوں کے دوش بدوش نظامِ حکومت میں حصّہ لینے کا موقع دیا جائے]

میرے لیے ضروری ہی کہ مَیں اِن نام نہاد "مظلوم قوموں" کی نسلی کمتری اور پستی کو اچھی طرح جان لوں اور یہ اس کے لیے کافی ہی کہ مَیں اپنے لوگوں کی قسمت کو اِن کمتر نسلوں کی قسمت کے ساتھ کبھی وابستہ نہ ہونے دوں۔

اِن بیانات سے آپ خود نتیجہ نکال لیجیے۔ قیاس کُن زگلستانِ من بہارِ مرا

(۶)

اوراب دنیا دوسری عالمگیر جنگ میں گرفتار ہی۔ یہ جرمنی کی علیحدگی پسند، نسل پرست شہنشاہیت کا عظیم ترین کارنامہ ہی۔ اگر جنگ میں جرمنی کو کامیابی ہوئی تو دنیا کا معاشرتی نقشہ یہ ہوگا کہ دنیا چار طبقوں (چار ذاتوں) میں تقسیم ہوگی۔ سب سے بڑا طبقہ جرمن حکمران طبقے کا ہوگا۔ دوسرا طبقہ تمام جرمنوں کا ہوگا جن کو اور تمام باشندوں کے مقابل نسلی برتری اور حاکمانہ برتری حاصل ہوگی۔ تیسرا طبقہ غیر جرمن یورپی باشندوں کا ہوگا (جن کی حیثیت ویش طبقے کی سی ہوگی) اور چوتھا طبقہ دنیا کے غیر یورپی باشندوں کا ہوگا جن کی حیثیت غلاموں سے بدتر ہوگی اور جن سے جانوروں کا سا سلوک کیا جائے گا۔ یہ ہولناک معاشری نقشہ جس کا اندیشہ New Statesman and Nation. نے اپنے ایک مقالۂ افتتاحیہ میں ظاہر کیا ہی اُسی صورت میں صفحۂ امکان سے مٹ سکتا ہی کہ اس جنگ میں جمہوریت پھر کامیاب ہو اور نسل پرست آمریت کا خاتمہ ہو جائے۔

